فارسی پر اُردو کا اثر

از پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

صدرِ شعبۂ اُردو۔ سندھ یونی ورسٹی، حیدر آباد

(سابق صدرِ شعبۂ اردو۔ ناگ پور یونیورسٹی)

۱۹۶۰ء

قیمت ۸/-

فہرست مضامین

بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کے نام

مقدّمہ

یہ مضمون مخدومی نواب صدر یار جنگ مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم و مغفور کی فرمائش پر آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ پونا میں ۲۹ر دسمبر ۱۹۴۰ء کو پڑھا گیا تھا۔ اس کے بعد رسالہ معارف (اعظم گڈھ۔ فروری تا مارچ ۱۹۴۱ء) میں شائع ہوا۔ اب مزید اضافوں اور ترمیم کے بعد موجودہ شکل میں نذرِ ناظرین ہے۔

جن کتابوں اور ماخذوں سے استفادہ کیا گیا ہے ان کا حوالہ دیدیا گیا ہے۔ استدراک اور استنباط کی نشان دہی بھی کردی گئی ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ کوئی چیز غیر مستند نہ آنے پائے۔ تاہم بشریت کے تقاضے سے راقم الحروف بھی مجبور ہے اور پردہ پوشی کے لیے اللہ پاک کی بارگاہ میں سر بسجود ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مضمون مختصر ہے لیکن جس نہج پر تیار کیا گیا ہے اور ایک ایک لفظ کے لیے جس طرح کاوش کی گئی ہے وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ وما توفیقی الا باللہ

آخر میں "اشاریہ" بھی ہے

دوسرا ایڈیشن یہ مضمون ۱۹۵۲ء میں کتابی شکل میں پہلی بار شائع ہوا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ بعض یونی ورسٹیوں میں داخلِ نصاب ہوا اور قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ اب کچھ اور ترمیم و اضافہ ہے۔ خدا کرے کہ مفید ثابت ہو۔ فقط

غلام مصطفٰے خاں

۵ جنوری ۱۹۶۱ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زبان کی اہمیت

یہ عجیب بات ہے کہ زبان اپنی ہوتے ہوئے بھی محض اپنے لیے نہیں ہوتی بلکہ دوسروں ہی کے لیے ہوتی ہے اور وہ ہمیشہ غیر ہی کی محتاج ہے۔ اس کے لیے بولنے والے سے زیادہ سننے والے کی ضرورت ہے۔ ورنہ وہ اُس پاگل کی بڑ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی جو خود ہی بولتا ہے اور خود ہی سُنتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حضرتِ انسان نے اپنی ضرورت کے اظہار کے لیے سب سے پہلے اشاروں سے کام لیا ہوگا۔ پھر اِن اشاروں کے لیے کوئی آواز مقرر کی ہوگی اور وہ آواز ایک زمانے کی تراش خراش کے بعد ایک زبان کی شکل میں نمودار ہوئی ہوگی۔ تاہم ایسی صورت میں اس کا کوئی مخصوص ماحول ضرور رہا ہوگا جس سے ایک ہی فرد متعلق نہ رہا ہوگا بلکہ دوسرے لوگ بھی اپنی معیشت اور معاشرت کی خاطر وابستہ ہوں گے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ زبان کا تعلق کسی مخصوص ثقافتی، معاشرتی یا جغرافیائی حدود سے ہوا کرتا ہے۔ پھر یہ حدود بھی ہمیشہ ایک حالت پر قائم نہیں رہ سکتیں۔ حالات کے ساتھ جب ان میں تغیر ہوتا ہے تو وہاں کی زبان بھی بدل جاتی ہے۔ پُرانی چیزوں کے ختم ہو جانے یا بدل جانے سے ان کے کام کے ساتھ ان کے نام بھی ترک ہو جاتے ہیں اور نئی نئی چیزوں کے ساتھ نئے نئے الفاظ کا اضافہ

ہوتاہے۔ کون ہے جو وکی یا میر کے عہد کی زبان اب بھی مِن وعَن بولتا ہے اور کسے دعویٰ ہے کہ اس کی آج کی زبان سو پچاس سال کے بعد بھی ہو بہو قائم رہے گی؟۔ آج سے ۲۰-۲۵ برس پہلے کبھی ادبار کی مجلس میں ایسے فقرے نہیں سُنے جاتے تھے کہ "اس مسئلے پر روشنی ڈالیے۔ چیز یہ ہے کہ۔ مجھے پتا نہیں۔ میرا نقطۂ نگاہ یہ ہے۔ ایک طائرانہ نظر ڈالیے۔ چند ایک باتیں۔ ایسا کیا، نہ ہی ویسا کیا۔ سنسنی خیز واقعہ ہے۔ جہاں تک فلاں چیز کا تعلق ہے۔ آج کل کافی سردی پڑ رہی ہے (گویا پہلے ناکافی تھی)۔ اُنتّیس یا اِکتّیس تاریخ کو۔ وغیرہ۔ وغیرہ"۔ اسی طرح بار بار "ظاہر ہے کہ"۔ "بات در اصل یہ ہے کہ"۔ "بہر حال، بہر طور، بہر نوع، بہر کیف" وغیرہ کی بھرمار بھی نہیں تھی۔ لیکن آج اِن سکّوں کا چلن ہے اور کس کی مجال ہے کہ وہ اُنھیں ٹکسال باہر سمجھے؟ زندہ زبانوں کے بڑھنے اور پھیلنے کے یہی قرینے ہوا کرتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں ہوتا کہ ایک خاص ذہنیت کے تحت کوئی فرد یا جماعت اپنے مخصوص الفاظ یا زبان کسی پر تھوپنے لگے۔ جہاں کہیں اور جب کبھی اِس قسم کی کوشش ہوئی ہے وہ ناکام ہی رہی ہے اور ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ سیاست دانوں نے نہ صرف غیر منقسم ہندوستان میں اس معاملے میں شکست کھائی ہے بلکہ بعض "فضلاء" نے بھی بغیر سوچے سمجھے جب مشرقی پاکستان میں اردو جیسی مقبول زبان کے لیے غلط قسم کا پروپگنڈا کیا تو بجائے فائدے کے اُسے سخت نقصان پہنچا اور وہاں بنگالی جیسی "ہند نواز" زبان، قانون کے بل بوتے پر قائم ہو گئی، حالانکہ غیر منقسم ہندوستان میں خود بنگال کے لوگ اردو کے زبردست حامی تھے۔ بہر حال اگر کسی زبان میں قوت

اور صلاحیت ہے تو وہ خود ہی دھیرے دھیرے عوام و خواص سبھی کے دلوں میں گھر کر لیتی ہے اور کوئی رکاوٹ اس کے لیے سدِّ راہ نہیں ہو سکتی۔

عربی پر فارسی کا اثر

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص جہاں بس گیا اور جو زبان سیکھ لی بس وہی اس کی زبان ہے۔ یہ اور بات ہے کہ زمان و مکان، وسائل و ذرائع، آب و ہوا اور غذا کی تبدیلی سے خود ایک ہی خاندان کی زبان بدل جائے اور یہ اس کی زندگی کی دلیل بھی ہے۔ پھر مختلف خاندانوں کی زبانیں بھی اپنے باہمی روابط کی وجہ سے تبدیل ہوتی رہتی ہیں اور ایک دوسرے سے قریب تر ہوتی جاتی ہیں۔ تاریخی اور سیاسی اعتبار سے عربی اور فارسی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ فارسی جو آریائی زبان ہونے کی وجہ سے اپنے اندر زیادہ لچک رکھتی ہے وہ تو عربی سے متاثر ہونے والی ہی تھی لیکن عربی جیسی سامی زبان بھی فارسی کی روادار رہی۔ چنانچہ بعض محققین کا خیال ہے کہ قرآن پاک میں غیر عربی بلکہ فارسی[۱] الفاظ بھی ہیں۔ مثلاً سورۂ فیل میں لفظ "سجّیل" ہے جو بعض مفسرین کے نزدیک "سنگ گل" کا معرب ہے۔ اسی طرح قرآنی لفظ "سُندُس" ہے اس کے علاوہ "استبرق" کو "استبرہ" اور "سرادق" کو "سراپردہ" کا معرب بتایا گیا ہے۔ لفظ "فردوس" کو بھی فارسی لفظ کہا گیا ہے، ان کے علاوہ اور بہت سے فارسی الفاظ معرب ہوئے مثلاً "عرض" کے مقابلے میں جو "جوہر" ہے وہ فارسی لفظ "گوہر" سے معرب ہے اور گناہ سے جناح معرب ہوا۔ اسی طرح "استاد" سے "استاذ"[۲] اور "گریبان" سے "جربان" وغیرہ الفاظ

---

۱ علامہ سیوطیؒ نے غیر عربی قرآنی الفاظ پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔

۲ یوں بھی متقدمین کے یہاں ذال کا رواج بہت تھا۔ مثلاً سنائی لکھتے ہیں:

گر نو نسیم ترا یکے تعویذ پاک دارے جوان مدار پلید

(باقی بر صفحہ آئندہ)

عربی میں آئے۔ علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کی کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ہندوستانی الفاظ "مشک" "زنجبیل" اور "کافور" بھی قرآن پاک میں جگہ پائے ہوئے ہیں، بقول صاحب رشیدی لفظ طلا بھی ہندوستانی لفظ "تلہ" کا معرب ہے، جو پھر مطلا ہوا۔ اسی طرح "کھانڈ" یا "کھنڈ" ایران جا کر "کند" ہوا اور عربی میں "قند" اور پھر "قناد" (حلوائی) وغیرہ بن گیا۔ مسعودی نے "آم" کو "انبج" لکھا ہے۔ اصطخری نے نیبو کے ذکر میں لکھا ہے کہ سندھی زبان میں "لیموں" کہتے ہیں۔ ابوریحان البیرونی نے کتاب الہند ص۲۹۵ میں ہندوستان کے نصف ماہی ناموں کے ذکر میں ایک سے پندرہ تک کی گنتی لکھی ہے جیسے اور (اماس) برقہ (پڑوہ) بیہہ۔ تریہ وغیرہ۔ تذکرۂ دولت شاہ کے دیباچہ میں ہے کہ رباعی ایران کی ایجاد ہے اور اسے پہلے "دوبیتی" کہتے تھے، اسی لیے عرب میں یہ "دوبیتی" کہلائی۔ حالانکہ بعد میں ایران نے اسے "رباعی" نام دیا۔ خان آرزو نے چراغ ہدایت میں لکھا ہے کہ "مدینہ" بھی عربی لفظ نہیں بلکہ ژندو پاژند کی زبان ہے جس میں "مدینا" مستعمل ہے اور اب اختصار کے لیے "مدینیدم" کے معنی "زیارت مدینہ کردم" سے لیے جاتے ہیں۔ ان مثالوں سے یہ بتانا مقصود تھا کہ عرب بھی عجم یعنی "گونگے" ملکوں کا محتاج ہوا۔

(بقیہ حاشیہ از صفحۂ گذشتہ)

۵۔ توشوی روز حشر ازاں ماخوذ   واں زماں حسرتت نہ دارد سود

(حدیقہ۔ طبع لکھنؤ۔ ص ۱۷۱ و ۶۷۹۔)

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کا مضمون ارمغانِ علمی (لاہور۔ ص ۱۳۹۔ ۱۹۵۵ء) میں "ذال معجمہ فارسی میں" ملاحظہ فرمائیں۔

فارسی پر عربی کا اثر

اب دوسرا رُخ دیکھیے کہ عربی نے فارسی پر کیا اثر کیا؟ مقاماتِ حمیدی، تاریخِ وصّاف، ظفر نامہ تیموری، تاریخ عالم آرائے عباسی اور درۂ نادرہ جیسی "عربی نواز" کتابوں پر تو عربی چھائی ہوئی ہے لیکن شاہنامہ اور نامۂ خسروی جیسی "تارک عربی" کتابوں میں بھی عربی موجود ہے اور بغیر اس کے چارہ نہیں ہے۔ عربی الفاظ کے استعمال کی اس کثرت کے ذمہ دار کچھ تو عرب فاتحین ہیں لیکن زیادہ تر ایرانی ہی ہیں جو خود عربی کے مایۂ ناز فاضل اور ادیب ہوئے ہیں چنانچہ انھوں نے بہت سے عربی الفاظ، فارسی رنگ میں پیش کیے اور فارسی الفاظ پر عربی رنگ چڑھایا۔ مثلاً ازرقی (المتوفی ۵۲۷ھ) نے "کرتہ" بھی لکھا ہے:-

ازسیم خام برگ برآوردہ یاسمیں | باززِ پختہ کرتہ بدل کرد اقحوان [1]

اور اسی شاعر نے "قرطہ" بھی لکھا ہے:-

آسماں گون قرطہ پوشیدآں چہ ماہِ آسماں | مہر چہر آمد سبز دِ بندہ روزِ مہرگاں [2]

اسی سے عربی میں "قرطق" بن گیا۔ جیسے چیک سے عربی میں سک بنا۔ اسی عربی رنگ نے نازک سے "نزاکت" لفظ بنایا، "روغن" سے "مرغّن"، "لبالب" سے "ملبّب" اور "ریش تراشیدن" سے "مترّش"۔ جیسے ابو نصر نصیرائے بدخشانی کا شعر ہے:-

---

[1] مونس الاحرار قلمی ص ۶۱۲ جیب گنج۔

[2] دیوان ازرقی۔ آصفیہ۔ دکن۔ ابوالمعالی نصراللہ نے ۵۳۹ھ میں عبداللہ ابن المقفع کی عربی کلیلہ و دمنہ کا فارسی ترجمہ کیا تھا اُس میں باب البلاروالبراہمہ کے تحت یہ شعر آتا ہے:-

صدروح برانگیختہ از دامنِ کرتہ | صدروز برافروختہ از گوشۂ شیّوش

لباب الالباب (ج ۲ ص ۵۰۲) میں علی بن عمر الغزنوی کا وہ قصیدہ جو خسرو ملک غزنوی کی مدح میں ہے ایک شعر میں اسی لفظ کا حامل ہے:-

زرشکِ کرتہ تنگت چو گویم تا چہ دل تنگم | کہ بے مہر و وفا یارے در آغوشم چرا باشد

نردِ مسلماں نبود شایاں　　بہرِ امامت مردِ مترشش

پھر "ششدر" سے "مششدر" بنایا گیا، جسے شاید مجیر بیلقانی (م ۵۹۴ھ/۱۱۹۷ء) نے سب سے پہلے استعمال کیا ہے:-

کم زناں نردِ دغا باختن آغاز کنند　　مہرۂ خصم بر امیدِ مششدر گیرند [۱]

اسی طرح "زلف" سے "مزلف" بنایا گیا، ممکن ہے کہ کوئی صاحب اسے عربی لفظ سمجھیں لیکن آرزو نے اسے فارسی ہی سمجھا ہے اور محمد اسحٰق شوکت کا شعر پیش کیا ہے:-

مزلف است رخِ خامہ ام زبختِ سیاہ　　سوادِ شامِ فراقم خطِ لبِ جام است [۲]

پھر بعض فارسی مصادر بھی عربی لفظوں سے تراشے گئے۔ مثلاً طلبیدن، فہمیدن، رقصیدن، بلعیدن، غارتیدن، طلوعیدن، تمیزیدن وغیرہ۔ محمد ابراہیم سالک قزوینی (عہدِ شاہجہانی) کا شعر ہے:-

سالک بفروشند بہ بادۂ صافی　　کز ذائقہ اش محتسبِ مانہ تمیزد

پھر بعض فارسی الفاظ کی جمع عربی طریقے سے بنائی گئی۔ مثلاً فرمان سے فرامین، خان سے خوانین، پاجی سے پواج، نبیرہ سے نبائر، بُستان سے بساتین، جیسا کہ خاقانی نے بھی لکھا ہے:-

بساتین کہ ضائع شود در بساتین　　کز انجیر خواراں غرابے نہ بیند [۳]

رند سے "رنود" جو غالباً نجم الدین راوندی (م ۵۹۹ھ/۱۲۰۳ء) نے سب سے پہلے استعمال کیا ہے:-

آں خوردنی رنود بغارت بردند [۴]

---

[۱] راحت الصدور ص ۳۱۴ ۔ [۲] چراغِ ہدایت ۔ [۳] کلیات جلد اول ص ۹۲۹
[۴] راحت الصدور ص ۳۸۶ ۔

ف: یحییٰ شیرازی کا شعر ہے:- شد موے سپید و خرم نیست زغفلت - چوں خفتہ کہ غافل ز طلوعیدنِ صبح است

پھر یہ لفظ تاریخ جہانکشا اور جامع التواریخ وغیرہ میں بھی ہے اور عربی لفظ "کرایہ" سے اسم فاعل "کرایندہ" بنایا۔

"شفقت" جس کے معنی "خوف" تھے، فارسی میں "غمخواری" کے معنی میں آیا، پھر اس میں قافِ مشدد بھی رائج ہوگیا۔ مثلاً واعظ قزوینی کا شعر ہے:۔

سربلندی آرزو داری شفّقت پیشہ کن | کین علم را ریزشِ بارانِ احساں پرچم است[۲]

اور کبھی تشدید کو سکون سے بدل دیا مثلاً مزمّل کو صرف "مُزمَل" بھی فارسی شعرائنے لکھا ہے مثلاً ازرقی لکھتا ہے:۔

واں گردشِ مزمّلِ زریں شگفت را | گوئی بروشنی چو رواں اندر و رواں[۳]

کمالِ اسمٰعیل کے یہاں بھی ہے:۔

گل در لحافِ غنچہ خوش خفتہ بد سحرگہ | بادِ صبا بروخواند یا ایّہا المزمّل[۴]

غرض ایسی مثالیں بہ کثرت ملتی ہیں، کیونکہ جب دو شخص مختلف ملک و زبان والے آپس میں ملتے ہیں تو ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے کے الفاظ حتی الامکان استعمال کیے جائیں، تاکہ دوسرا شخص اس کی بات آسانی سے سمجھ سکے۔ پس زبان کے بننے اور وسیع ہونے کی اصل وجہ یہی ہے، اور یہی ایک ایسی چیز ہے جہاں کسی قسم کی تنگ نظری کام نہیں آسکتی۔

توافقِ لسانین

ہمیں اس مضمون میں یہی بتانا ہے کہ ہماری زبان نے کیسے کیسے فراخ دل لوگ شروع ہی سے پائے جنھوں نے اپنی مایۂ ناز زبانِ فارسی میں اور اس کے شہ پاروں میں ہماری "گھر بھاکھا" کو جگہ دی اور یہ محکوم و

۱و۲ چراغِ ہدایت۔ ۳ مونس الاحرار قلمی ص ۶۱۳ حبیب گنج۔ ۴ مجموعہ قصائد فارسی ص ۴۳ حبیب گنج۔

مذموم چیز اپنے حاکم پر غالب آگئی، یا یوں کہہ لیجیے کہ ایرانی ماں کی دو بیٹیاں (یعنی فارسی اور سنسکرت) جب دو مختلف ملکوں میں بیاہی گئیں تو حالات و مقامات کے بدل جانے سے ان کا رنگ روپ بھی بدل گیا، لیکن ان کی بعد کی نسلوں میں پھر رشتہ قائم ہوا اور جو اولاد پیدا ہوئی وہی دراصل اردو ہے، پھر اس اولاد کی وراثت اور ملکیت کو اس کی اصلیت پر قائم رکھنے اور پہچاننے کی غرض سے جو اصول بنائے گئے ہیں ان کا تعلق "لسانیات" سے ہے جس کے ذریعے ہم اپنی زبان کے بھولے بسرے الفاظ کی شکل و صورت پہچان سکتے ہیں۔ مثلاً ہماری زبان میں سب سے زیادہ عام فعل "ہے" بمعنی "ہست" ہے، یہ فارسی میں بھی آیا ہے اور مولانا مختار احمد صاحب نے قاموس الاغلاط (ص ۱۸۲) میں یہ اشعار ثبوت کے لیے دیے ہیں:-

حافظؒ:-

ساقی اگرت ہوائے ما ہے | جز بادہ میار درمیاں شے

حکیم سوزنی:-

ہیم بہ پلۂ نیکی زریک سپنداں کم | بہ پلۂ بدی اندر ہزار سندانم

مولانا رومؒ:-

گفت یارب مر ترا خاصاں ہیند | کہ مبارک دعوت و فرخ پیند

اسی طرح لفظ "ابدھر" جو میر اور سودا کے عہد تک تھا، فردوسی (شعر العجم جلد اول) سے لے کر بعد کے متقدمین کے یہاں بھی ہے، مثلاً سید حسن غزنوی (المتوفی سنہ ۵۵۶ھ) کہتے ہیں:-

ناوردۂ بہ شعر چو من در ہزار سال | اینک تو ابدری فلکا و من ابدرم

یا مجیر بیلقانی (المتوفی ۵۹۴ھ/۱۱۹۷ء) کہتا ہے :-

غافل نیم ز عالمِ جاں در بسیطِ خاک مانندِ آفتاب ہماں جا ہم ایدرم

اِس "ہے" اور "ایدر" کی طرح بعض مرکب الفاظ بھی دونوں زبانوں میں ہو بہو اپنی اصل شکل میں قائم ہیں، مثلاً دشنام، دشمن، شگون وغیرہ، لیکن شلنگ اور پھلانگ چتر اور چھتر، جاروب اور جھاڑو، بہمن اور پھاگن، کاہ اور گھاس میں جو توافق لسانین پایا جاتا ہے وہ دراصل آب وہوا اور غذا کے اختلاف کو ظاہر کر رہا ہے، ورنہ فطرت اور اصلیت دونوں کی ایک ہی ہے۔ اسی سلسلے میں ایک بات اور عرض کرنی ہے کہ علمِ تجوید کے جاننے سے "لسانیات" میں کوئی الجھن باقی نہیں رہتی کیونکہ موخر الذکر میں حروف کا ردوبدل سوائے چند مستثنیات کے بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ادغام متجانسین[1] اور ادغام متقاربین[2] میں پایا جاتا ہے۔ بہرحال لسانیات کے متعلق اس معترضہ بحث کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہماری زبان جو بالخصوص فارسی اور سنسکرت کا صدقہ ہے، اتنی صلاحیت رکھتی ہے کہ ان زبانوں میں گھل مل جائے۔ چناں چہ مختلف اسباب کی بنا پر جب ہمارے ملک کا تعلق فارسی والے ملکوں سے ہوا تو ہمارے بہت سے الفاظ وہاں بھی رائج ہوئے۔ اس طرح کم از کم پانچویں صدی ہجری سے یہ الفاظ تواتر کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

ہم نے اپنی آسانی کے لیے اس کے مختلف دور قائم کیے ہیں جو حسب ذیل ہیں:-

پہلا دور — یعنی پانچویں اور چھٹی صدی ہجری

---

[1] یعنی ایک ہی مخرج کے حروف آپس میں بدل جائیں جیسے ت، د، ط وغیرہ

[2] یعنی قریب المخرج حروف آپس میں بدل جائیں جیسے ل، م، ر، ن وغیرہ

اس میں شک نہیں کہ مستشرقین نے ہماری زبان کے بعض ایسے الفاظ بھی گنائے ہیں جو پانچویں صدی ہجری سے پہلے عربی یا دیگر زبانوں میں شامل ہو چکے تھے لیکن ہم یہاں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس زبان نے فارسی پر کس طرح بتدریج غلبہ حاصل کیا۔ چنانچہ اس غلبے کی ابتدا ہمیں محمود غزنوی (المتوفی ۴۲۱ھ / ۱۰۳۰ء) کے عہد سے معلوم ہوتی ہے۔ اس نے ہندوستان پر متعدد حملے کیے اور دولت کے علاوہ ہندی لونڈی غلام اس قدر حاصل کیے کہ غزنین کے ہر گھر میں ان کی فراوانی ہو گئی خود اس کی فوج میں بہت سے ہندوستانی تھے۔ اس کے دربار میں ہندی کا مترجم تلک نامی ایک ہندو تھا۔ اور سلطان مسعود کے زمانے میں (جو ۴۲۱ھ میں تخت نشین ہوا تھا) اس عہدے پر ایک ہندو سیر پل سرفراز تھا۔ سلطان محمود کے دربار میں جہاں عرب و عجم کے ادبا رہتے تھے فضلائے ہند بھی ان کے پہلو بہ پہلو تھے۔ کالنجر کے راجہ نندا نے ۴۱۳ھ / ۱۰۲۲ء میں ہندی زبان میں بادشاہ کے لئے شعر لکھے تھے۔[۵۱] سلطان ابراہیم غزنوی (۴۹۲ھ) کے عہد میں ابو النجم زریر شیبانی سپہ سالار تھا۔ اس نے ایک طرف بنارس اور دوسری طرف سومنات تک حملے کیے۔ اس کے بعد مسعود ثالث (م ۵۰۸ھ) کے زمانے میں سرستی پر بھی قبضہ ہوا۔[۵۲] پھر اس کے بیٹے سلطان بہرام شاہ (م ۵۵۵ھ) کے عہد میں[۵۳] اس کے دو وائسرائے محمد ابو حلیم اور حسین ابن ابراہیم علوی نے غزنوی مقبوضات کی ہندوستان میں پوری پوری نگرانی کی۔ بلکہ روجرس کی فہرست مسکوکات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ

---

[۵۱] نقوش سلیمانی (مولانا سلیمان ندوی) ص ۳۵ "پنجاب میں اردو" ص ۳۵ و ۳۶

[۵۲] "پنجاب میں اردو" (حافظ شیرانی) ص ۳۱۔ [۵۳] راقم کی تاریخ بہرام شاہ غزنوی (انگریزی) مکتبۂ کارواں، لاہور سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہو گئی ہے۔ اس میں یہ تفصیلات درج ہیں۔

آخری سلاطینِ غزنویہ نے اپنے ہندوستانی سکّوں میں بیل (یا گائے؟) کا سر اور سنسکرت خط میں "شری سمنتادیو" بھی کندہ کرایا تھا۔ یہ ان سلاطین کی رواداری کی بے مثل یادگار ہے جن کو متعصب کہا جاتا ہے۔

غزنوی سلاطین کی فوجوں میں شروع ہی سے ہندوستانی لوگ داخل ہوتے رہے بلکہ بہرام شاہ نے غزنین کا تخت جو سیف الدین سوری کے قبضے میں چلا گیا تھا، ہندوستانی فوجوں ہی کی مدد سے حاصل کیا تھا۔ اس کے درباری شاعر سید حسن غزنوی (م ۵۵۶ھ) نے اس فتح کے متعلق جو جمعہ ۲ محرم ۵۴۴ھ (۱۳ مئی ۱۱۴۹ء) کو واقع ہوئی تھی ایک قصیدہ لکھا تھا جس کے اس شعر سے ایسی فوجوں کی اطلاع ملتی ہے:-

به گردِ شاهِ فوجا فوج لشکرہائے ہندستاں   که گوئی ذرّه بر خورشید بر جوشید از خاور

اور بعد میں تو بہرام شاہ کے لڑکے خسرو شاہ (م ۵۵۵ھ) اور پوتے خسرو ملِک (م ۵۸۲ھ) نے لاہور کو اپنا دار السلطنت ہی بنا لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جب غزنوی فوجوں میں ہندوستانی شریک تھے بلکہ خود ہندوستانیوں کی مستقل فوجیں غزنوی سلاطین کے پاس تھیں، نیز غزنین وغیرہ میں ہندی غلاموں اور کنیزوں کی فراوانی تھی تو ضرور اُن کے رہنے سہنے اور ملنے جلنے سے ایک مخلوط زبان پیدا ہوئی ہوگی اور کم از کم اس سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے اختلاط و ارتباط سے فارسی زبان میں ہندوستانی الفاظ داخل ہونے لگے۔ چنانچہ فردوسی کے یہاں لفظ "کوتوال" جو دراصل "کوٹ والا" (یعنی مالکِ قلعہ) تھا اس طرح پایا جاتا ہے:-

چو آگاہ شد کوتوالِ حصار	برآویخت بارستیم نامدار[۵۱]

یہی لفظ زین الاخبارِ گردیزی میں جو ۴۴۰ھ کے قریب لکھی گئی اس طرح ملتا ہے :۔

"وامیر محمود مرسارغ رابہ کوتوالیِ آں قلعہ بگماشت[۵۲]"۔ ۔ ۔ ۔ ومر علی بن قدر را

با حوق را کوتوالی آں قلعہ داد[۵۳]"۔ ۔ ۔ "وسوے کوتوالِ کسری از زبان امیر محمد پیغام

رسانید ند وامیر محمد را ازاں خبر نہ بود تا کوتوالِ کسری او را بکشت[۵۴]"۔

تاریخ بیہقی میں متعدد مقامات پر یہ لفظ ملتا ہے :۔

"۔ ۔ ۔ بو علی کوتوال و دیگر اعیان و متقدمان نشستہ بودند وطاعت و بندگی

نمودہ و بو علی کوتوال گفتہ کہ از بردِ ما آں شغل برنیاید"۔

پھر راحت الصدور میں بھی یہ لفظ آیا ہے۔ لیکن حیرت ہوتی ہے کہ عربی تاریخ "اخبار الدولۃ السلجوقیہ" جو ۶۲۲ھ کے قریب لکھی گئی اس کے صفحہ ۲۷ میں بھی یہ لفظ

---

۵۱ "پنجاب میں اردو" (حافظ شیرانی) ص ۲۹۔ تکمیلِ شاہ نامہ کے متعلق فردوسی کہتا ہے :۔

زہجرت شدہ پنج ہشتاد بار	کہ گفتم من ایں نامۂ شہریار

لیکن جلد سوم میں فردوسی نے محمود کی معافیِ مال گذاری کا تذکرہ کیا ہے جو خراسان کے قحط کے موقع پر عمل میں آئی تھی اور یہ قحط ۴۰۱ھ میں (تاریخ یمینی) پڑا تھا۔ اس لیے شاہنامہ کی تکمیل یا کم از کم اس واقعے کا اضافہ ۴۰۱ھ کے بعد ہوا ہوگا۔ شاہ نامہ کے اعداد ۴۰۲ ہوتے ہیں اور ممکن ہے کہ اس کا سالِ تکمیل یہی ۴۰۲ھ ہو۔ اسی طرح فردوسی کے اعداد ۳۶۰ ہوتے ہیں اور ممکن ہے کہ اسی سال سے اس کی شاعری کا آغاز ہوا ہو۔ تاہم یہ میرا خیال ہی ہے کیونکہ اس زمانے میں اعداد کا ایسا التزام رائج معلوم نہیں ہوتا۔ استاذی پروفیسر ضیاء احمد صاحب نے میرے ان خیالات کا حوالہ رسالہ اردو ادب (علی گڑھ۔ دسمبر ۱۹۵۶ء) میں دیا ہے۔

۵۲ قزوینی ایڈیشن۔ ص ۵۶۔ ۵۳ ایضاً ص ۶۲

۵۴ ایضاً ص ۸۸۔

اسی معنی میں مستعمل ہے۔

فردوسی کے یہاں ہندوستانی پگڑی یعنی "شارہ" بھی مستعمل ہے:۔

زسر شارۂ ہندوی برگرفت — زگفتار او ماند شکلِ شگفت

فرخی (م ۴۲۹ھ ۱۰۳۸ء) کے یہاں ہمارے یہاں کی "کھاٹ" (Cot) کو کتنا بلند پایہ حاصل ہوا ہے:۔

زکت ہائے زرّیں وشاہانہ زیور [۵۱] — خلافت جدا کرد جیپالیاں را

لیکن ہوسکتا ہے کہ یہ لفظ سنسکرت اور فارسی دونوں کا ہو۔ کیونکہ اورنٹیل کالج میگزین (نومبر ۱۹۴۲ء) میں حافظ شیرانی صاحب نے خسرو پرویز اور عرب عمال کے ایرانی مسکوکات کی جو فہرست دی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر سکوں میں "افزوت گدہ" (بمعنی افزوں باد ملک) منقوش تھا۔ یہ "گدہ" سنسکرت کی "گدی" ہوگا۔ اور فارسی میں "کدہ" اور "کت" ہوگا۔ فرخی کے یہاں "والا" (اسم فاعل) بھی ملتا ہے:۔

شاگرد باشد افزوں زبہرام [۵۲] — نخچیر والانِ ایں مملکت را

شیرانی صاحب (رسالہ "اردو" جنوری ۱۹۴۳ء ص ۳۶) لکھتے ہیں کہ "شمن" (بمعنی بت پرست) بھی اپنے یہاں کا لفظ ہے اور فرخی نے استعمال کیا ہے:۔

اندیشۂ دشمن نہ ہمانا کند شمن — اندیشۂ رعیت چنداں کہ او کند

چوں شمن در بہار پیش وثن — زائراں را مثل نماز برد

اور تاریخ زین الاخبار (ص ۶۸) میں ہم کو یہ معنی اور اس کا ہندوستانی تعلق اور بھی

---

۵۱ اورینٹل کالج میگزین (نومبر ۱۹۲۹ء ص ۶) میں اسدی کے یہاں بھی "کت" بتایا گیا ہے:۔

دگر بارہ با زآمدم رزم جوے — بدو گفت مہراب شد را بگوے

برم زیں سراندیب بے تن سرت — کہ پرخوں نمایم کت و افسرت

۵۲ ایضاً (نومبر ۱۹۳۸ء ص ۲۹)۔

واضح ہو جاتا ہے:- "...... چوں نزدیکِ شہر (سومنات) رسید و آں راشمنان و برہمنان بدیدند بپرستشِ بتان مشغول گشتند"

فرّخی کے یہاں "شل" (سیلِ ہندی) بھی آتا ہے:-

بگونۂ شلِ افغانیاں دو پرّہ و تیز چو دستہ دستہ بہم تیرہا ے بے سوفار [۵۱]

فرخی کے یہاں "جوزِ ہندی" (ناریل) اور "پوپل" (چھالیا) کا ذکر بھی آتا ہے:-

در او درختاں چوں جوزِ ہندی و پوپل کہ ہر درخت بہ سالے دہد بکرّر بر

مولانا سلیمان ندوی صاحب نے سنائی (م ۵۴۵ھ) کے سلسلے میں [۵۲] کہا ہے کہ "میدہ" بھی ہندوستانی لفظ ہے لیکن یہ لفظ سنائی سے بہت پہلے فرخی کے یہاں بھی ہم کو ملتا ہے:-

ہر کہ غزنین دیدہ باشد در بہاراں کے بود ہر کہ تازہ میدہ بیند چوں خورد نانِ جویں

فرخی کے ہم عصر منوچہری (م ۴۳۲ھ/۱۰۴۱ء) کے یہاں بھی کئی لفظ ملتے ہیں ایک تو وہی "شمن" ہی:-

تا ہمی خندی ہمی گریی و ایں بس نادر است ہم تو معشوقی و عاشق ہم بُتی و ہم شمن

شمن سے منوچہری کو ہندوؤں کی "لنگھن" یاد آئی:-

الا تا مومناں دارند روزہ الا تا ہندواں گیرند لنگھن [۵۳]

---

[۵۱] پنجاب میں اردو۔ ص ۳۰۔ [۵۲] نقوش سلیمانی ص ۳۰۶ "میدہ" سے "خلالِ مائدہ" کی یاد آتی ہے جسے غیاث اللغات (ص ۱۶۳) میں عید کی سویوں کا مترادف کہا گیا ہے۔

[۵۳] سنائی نے بھی استعمال کیا ہے:-

گرہمی لنگھت کند فربہ سیر خوردن ترا ز لنگھن بہ

فوائد الفواد (ص ۸۶) میں اور سیر الاولیاء (ص ۱۶) میں ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء نے یہ شعر پڑھا تھا۔ ایک مخطوطہ کبھی نظر سے گزرا تھا۔ اس میں مختلف اقسام کے اذکار درج تھے اور ان اذکار کے لیے مخصوص نشستیں بھی لکھی ہوئی تھیں اسی میں حضرت بابا فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کے ایک ذکر میں یہ الفاظ تھے:- اُھو نہِ توں۔ اِھو نہِ توں، اِھِیں توں۔

پلپل[1] بھی منوچہری نے استعمال کیا ہے :-

توگوئی پلپل سودہ بکف داشت　　پراگند از کف اندر دیدہ پلپل

اسی نے ہمارے یہاں کا چندن (صندل) اور قمار (راس کماری) کا عود بھی استعمال کیا ہے :-

عنان برگردنِ سرخش فگندہ　　چو دو مارِ سیہ بر شاخِ چندن

چو بش ہمہ از صندل واز عودِ قماری　　سنگش ہمہ از گوہر و یاقوتِ ثمین است

اسی کے دوسرے معاصر عنصری (م ۴۳۱ھ / ۱۰۴۰ء) کے یہاں بھی یہی عود ملتا ہے :-

ہمی تا برزند ہنگام نوروز　　نسیمِ باغ با عود قماری

شود گلبن عماری و گلِ زرد　　چو کوکبہائے زریں بر عماری[2]

عنصری نے "لاکھ" کا عدد بھی ہم سے لیا ہے :-

دراو نہ سایر ماند و نہ طایر از بر خاک　　دو لک ز لشکر او شد بزیرِ خاک نہاں[3]

پانچویں صدی ہجری کے حکیم قطران تبریزی کے یہاں ایک لفظ "جندال" ملتا ہے جو یقیناً چنڈال کا معرب ہے :-

ور بشب باد آورد جندال ہنداز کینِ تو　　باز نشاند بہ روز از قامتِ جندال دال[4]

پانچویں صدی کے رُبع سوم میں اسدی طوسی نے لُغتِ فُرس لکھی تھی اس میں یہ الفاظ آتے ہیں (تہران ۱۳۱۹ھ شمسی۔ مرتبہ عباس اقبال) :-

کت - بوشکور کا شعر ہے :-

---

[1] جوز ہندی، پلپل اور عود قماری کا تعلق ہندوستان سے ضرور ہے گو کہ یہ الفاظ دراصل یہاں کے نہ ہوں۔
[2] دیوانِ عنصری - طبع لکھنؤ ۱۹۲۳ء ص ۱۱۳ -
[3] ایضاً ص ۱۰۰ -
[4] مونس الاحرار ص ۷۰۴، مخطوطہ حبیب گنج -

روزِ اورمزد است شاہا شاد زی
بر کفِ شاہی نشین و بادہ خوار ص۴۴

نال بمعنی نے بھی غالباً ہمارے ملک کا لفظ ہے۔ فرخی کا شعر ہے:- ص۳۱۲

از لبِ جوی عدوی نو بر آید ز نخست
زیں سبب کاستہ و زرد و نوان باشد نال

لکھن۔ خود اسدی کا شعر ہے:-

گرفتہ ہمہ لکھن و بستہ روے
کہ و مہ زنخ سادہ کردہ زموے ص۴۰۲

پھر اس عہد کے شاعر ابوالفرج رونی (جن کا انتقال ۴۹۷ھ کے بعد ہوا[1]) کے یہاں بھی ایک دو لفظ ملتے ہیں۔ مثلاً "بیلک" جو بقول صاحبِ شرف نامہ ہندوستانی دو شاخہ تیر ہے، رونی کے یہاں استعمال ہوا ہے:-

چرخ گردندۂ شہاب انداز
کاندر آورد بیلک اندازی[2]

شل بھی رونی نے استعمال کیا ہے:-

نہ کند کار تیر آیا زی
شلِ ہندی و نیزۂ تازی[3]

ایک جگہ اور لکھا ہے:-

شلِ او بر کتفِ گرگ نشست
جو ہر گرگ فرو ماند ز کار[4]

ایک جگہ رونی نے "یک دند" (دند۔ دانت کی پنجابی شکل) استعمال کیا ہے:-

بہ شکلِ پیل یک دندش نگہ کن
نعم چوں پیلِ یک دندش ہزار است[5]

پھر مسعود سعد سلمان (م ۵۱۵ھ/۱۱۲۱ء) کے یہاں برشکال (ورس کال۔ بارش کا موسم) ملتا ہے:

برشکال اے بہارِ ہندستاں
اے نجات از بلائے تابستاں

۱؎ اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۳۲ء ص ۵۵۔ ۲؎ دیوان رونی۔ چاپ تہران ایڈیشن ص ۱۱۶
۳؎ ایضاً ص ۱۱۶۔ ۴؎ ایضاً ص ۴۵۔ ۵؎ اورینٹل کالج میگزین۔ مئی ۱۹۳۸ء ص ۵۳۔

"کت" بھی استعمال کیا ہے :۔

برایں تیغ کوہِ گل انبار گوئی — چو فغفور بر تختم و فور بر کت[1]

حافظ شیرانی مرحوم نے لکھا ہے کہ اس شاعر نے ایک ہندی محاورہ "مارا مار" بھی استعمال کیا ہے :۔

چو رعد از ابر بغرید کوسِ محمودی — بر آمد از پسِ دیوارِ حصن مارا مار[2]

موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ مسعودِ سعدِ سلماں نے جو غزلیات شہوریہ (جیسے ہندوستانی میں نظم بارہ ماسہ۔ ہر مہینے کے نام پر)، اسبوعیہ (ہفتے کے دنوں کے نام پر) اور ایامیہ لکھی ہیں وہ سب کی سب ہندوستانی تقلید کی گواہی دیتی ہیں اور وہ یقیناً ایرانی طرز شاعری سے مختلف ہیں۔[3]

"شارہ" کا ذکر فردوسی کے سلسلے میں آچکا ہے یہی لفظ فلکی شروانی کے یہاں بھی ہے :۔

مدام تا کہ بپوشد زمانہ جرمِ زمیں را — گہے بہ اطلس و اکسوں گہے بہ شارہ و ملحم[4]

سنائی نے بھی استعمال کیا ہے :۔

خارہ در تفتِ او چو خار سبک — شورہ بر سنگِ او چو شارہ تنک[5]

ہمارے یہاں کی "لاکھ" بھی سنائی کے یہاں ہے :۔

زیں سپس عکس خوں ز کرۂ خاک — آسماں را کند بہ سرخی لاک[6]

۲۶ عہ سنائی کے یہاں لفظ "پانی" دو جگہ ملتا ہے۔ ایک شعر پروفیسر شیرانی نے (پنجاب میں اردو)

---

[1] دیوان مطبوعہ تہران ۱۳۱۸ - ص ۵۰۷ - [2] پنجاب میں اردو - ص ۳۹

[3] ایضاً ص ۳۸ - ۳۹ - اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۳۶ء ص ۶۷۔ اسی کی تقلید بعد میں امیر خسرو نے بھی کی تھی۔ [4] مجموعہ قصائد فارسی ص ۱۴۷ جیب گنج - [5] حدیقہ طبع لکھنؤ ص ۵۶۱ - [6] ایضاً ص ۶۲۵ -

نقل کیا ہے اور دوسرا مولانا سلیمان ندوی نے (نقوش سلیمانی ص ۳۶) اس کے علاوہ "بیلک" جو بقول شرف نامہ، ہندوستانی دوشاخہ تیر ہے، سنائی کے یہاں ہے:۔

خنجرش ہست روے ملک فروز بیلکش رائے سوز و ایلک دوز [1]

"ہیلاج" بھی بقول شرف نامہ، ہندوستانی ہے۔ سنائی کے یہاں ملتا ہے:۔

نسبت کدخدائی و ہیلاج کہ منجم بود بدو محتاج [2]

یہی الفاظ انوری (المتوفی ۵۸۵ھ / ۱۱۸۹ء) کے یہاں بھی ہیں:۔

بیلکے کز شستِ میمونت رود چوں اجل جوشن گسل دلدوز باد [3]

تراعطیۂ عمری چنانکہ ہیلاج است کند کبیسۂ سالش عطاے کبری را [4]

خاقانی (المتوفی ۵۹۳ھ / ۱۱۹۶ء) نے بھی ہیلاج استعمال کیا ہے:۔

تسییر براندند و براہین بفروزند ہیلاج نمودند کہ جاوید بقائی [5]

ہندوستانی حاکموں کے لیے فارسی میں "رائے" اور "رایانِ ہند" بہت مستعمل ہے لیکن انوری نے راجہ بھی استعمال کیا ہے:۔

خواجہ در بخل شد چناں معروف کہ ببلغ اندرون دود راجہ

ہر دو بایک دگر ہمی گفتند لعن بر بخل ایں چنیں راجہ [6]

انوری نے ایک ہندوستانی بلکہ سنسکرت لفظ "مندہ" گھوڑے کے لیے استعمال کیا ہے:۔

دارند بہ لفظ ترکی و ہندی از جود و مکارمت آت و مندہ [7]

---

[1] حدیقہ طبع لکھنؤ ص ۶۵۵ - [2] ایضاً ص ۸۱۲ - [3] کلیاتِ انوری ص ۱۳۱ - صفحہ ۱۸۰ و ۲۲۳ میں بھی یہی لفظ آتا ہے — [4] ایضاً ص ۱۶ — [5] کلیات جلد ۱ ص ۴۲۴ — [6] کلیات ص ۵۷۶ [7] ایضاً ص ۷۳۶ -

یہاں تک تو پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کے کلام میں اپنے الفاظ دکھائے گئے اب غزنوی عہد کو چھوڑ کر غوری عہد کے کلام سے ایسے الفاظ پیش کیے جاتے ہیں اور صرف ساتویں صدی ہجری کا ذکر کیا جاتا ہے کیونکہ وہ دور بھی ایک خاص سیاسی اور تاریخی ماحول سے متعلق ہے۔

دوسرا دور:۔ ساتویں صدی ہجری (یعنی تیرہویں صدی عیسوی) :۔

غوریوں نے ساتویں صدی ہجری کے شروع ہوتے ہی بہت جلد لاہور اور ملتان سے آگے بڑھ کر گجرات اور بنگال تک اپنے گھوڑے دوڑا دیے۔ اُن کے اس میل جول سے، جیسا کہ طبقاتِ ناصری (ص ۱۵۲۔ طبع کلکتہ) سے ظاہر ہوتا ہے پنجاب سے لے کر بنگال تک ایک ہی قسم کی بول چال رائج ہو گئی۔

قطب الدین ایبک جو ۶۰۳ھ ۱۲۰۶ء میں دہلی کا سب سے پہلا بادشاہ ہوا ہے وہ بقول فرشتہ (نقوشِ سلیمانی ص ۳۷) "لک بخش" (یعنی لاکھوں کا دینے والا) کے خطاب سے مشہور ہوا۔ اس کے زمانے کو "کال قطب الدین" کہا گیا اور اس کے سکّوں میں نام کے ساتھ "شری امیر" بھی لکھا ہوا تھا۔

شریف محمد مبارک شاہ نے ۶۰۷ھ اور ۶۳۳ھ کے درمیان "آداب الحرب والشجاعت" لکھی اور سلطان شمس الدین التمش کے نام پر معنوَن کی۔ اس میں بھی ہمارے الفاظ ملتے ہیں:۔ بیلک (تیر)۔ جری (جڑی)۔ ہدبانی (ہڈبانی پیکان)۔ جیورک (جیورکھ۔ یعنی محافظ جان۔ ایک قسم کا انگرکھا)۔ کوتوال۔ کہی (کسّی؟ سلاحِ گِل کاراں)۔ گہتی (گتھی = آہن بستہ سلاحِ شتربانان)۔ کٹارہ۔ وغیرہ اور ہندی تلواروں کے یہ نام ملتے ہیں:۔ پرالک۔ تراوتہ (تراوتی) روہنیا۔

مقبر (؟)۔ مان گوہر (؟)۔ پرگس (؟)[۱]

التمش (م ۶۳۳ھ) اور اس کے اسباط کے مداح تاج الدین سنگ ریزہ نے ایک شعر میں سیر اور من استعمال کیا ہے :-

خیز از مئے قدیم مرا سیر کن بہ رطل
بگذر ازیں حدیث کہ یک سیر و یک من است[۲]

طبقاتِ ناصری (منہاجِ سراج۔ نوشتہ ۶۵۸ھ) میں یہ الفاظ ہیں :-

۱) و اوبر سلطان سیلے زد۔ (ص ۱۱۸)

۲) بخششِ او لک لک و کشتنِ او لک لک۔

۳) و بہار بلغتِ ہندوی اسم مدرسہ باشد۔ (ص ۱۴۸)

۴) و اورا بلغتِ ہندوی سمندر گویند۔ (ص ۱۵۸)

۵) و مبلغ مردِ پایک (پیادہ) و سوار از بہرائچ بر سمتِ دہلی رواں شد (۲۰۹)

۶) بعد از مدتے کہ آں خدمت بجا آورد بہلہ (بٹوا۔ خریطہ) دار شد (ص ۲۵۴)[۳]

پھر اسی صدی کی دو فارسی تاریخوں میں ہمارے الفاظ جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ یہ تاریخیں ضیاء الدین برنی اور سراجِ عفیف کی ہیں۔

برنی کے یہاں یہ الفاظ ہیں : چبوترہ۔ بھنڈ (بھانڈ) چھپّر۔ دھاوہ (ڈاک

---

[۱] اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۳۰ء ضمیمہ (اقتباس از آداب الحرب ص ۴۲)

[۲] پنجاب میں اردو۔ ص ۴۳۔ بعد میں خسرو کی مثنوی مطلع الانوار میں بھی ہے :-

ور چہ بری لقمۂ سیری بزیر — سیر بود لقمۂ خور نیم سیر
آں کہ منش آرزوے تن بود — سیر بنا چار بیک من بود

[۳] اورینٹل کالج میگزین۔ نومبر ۱۹۲۹ء ص ۸

یا اُس کا ہرکارہ) گھاٹی۔ بھنگری و بھنگی۔ زمینِ اکھل۔ پٹواری۔ موٹھی و کنجد۔ ٹھگ۔ لونڈی۔ ٹیکہ۔ ڈھولک۔ تھانہ۔ چودھری۔ ماش وغیرہ۔

اور سراج عفیف کے یہاں یہ الفاظ ملتے ہیں:۔ پلنگ۔ چُنندہ۔ کڑہ (کڑاہی) مال (پکوان)۔ منگہ (مونگ)۔ ڈولہ (ڈول) گیل (راستہ) روزینہ (روزانہ) سالینہ (سالانہ) دائرہ (ڈیرا خیمہ) پونڈا۔ چھجہ۔ کھچڑی۔ چونہ۔ راج (معمار) کٹ گھرہ۔ چودھریان۔ لت۔ گھڑیال۔ چھتر وغیرہ۔ [۱]

مذکورہ بالا الفاظ سے ظاہر ہے کہ ہماری زبان ساتویں صدی ہجری سے بہت عام ہوگئی تھی اور پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کی بہ نسبت اس صدی میں اردو کے الفاظ فارسی میں زیادہ رائج تھے۔ اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں نے جب دہلی کو مستقل طور پر اپنا پایۂ تخت بنایا اور ان کا مستقل قیام ہندوستان میں ہوا تو ان کے میل جول میں وسعت پیدا ہوئی اور اس وسعت سے ہندوستانی الفاظ کے استعمال میں بھی وسعت ہوئی اور ایک ایسا مکمل ہیولیٰ تیار ہوا جس سے ہماری موجودہ اردو کی صورت پیدا ہوئی۔

اسی دور کے آخر میں امیر خسرو نے قران السعدین (۶۸۸ھ) اور مطلع الانوار (۶۹۸ھ) مثنویاں لکھیں جن میں بہت سے اردو الفاظ پائے جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی دوسری تصانیف کا ذکر آٹھویں صدی ہجری کے ذیل میں آئے گا اس لیے ان

---

[۱] اورینٹل کالج میگزین۔ نومبر ۱۹۲۹ء ص ۱۵۔ ۱۷۔ ۲۰۔ ۲۲۔ نقوشِ سلیمانی۔ ص ۱۵۔ برنی کی تاریخ میں جاروب دہانید (ص ۱۸۸) اور جاروب زنانید (ص ۲۳۲) کے فقرے بھی ہیں۔ یہ بھی غالباً اردو محاورے (جھاڑو دلوادی) کا ترجمہ ہے۔

مثنویوں کے متعلق بھی وہیں ذکر کیا جائے گا۔ کیونکہ وہ دَور ہماری زبان کے لیے بہت مبارک ثابت ہوا ہے اور اس میں نہ صرف اردو کے مستقل جملے بلکہ اشعار بھی پائے جاتے ہیں۔

تیسرا دور:۔ آٹھویں اور نویں صدی ہجری (یعنی چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی)۔

اس دَور میں داخل ہوتے ہی ہمیں فارسی تصانیف میں نہ صرف اردو الفاظ بکثرت ملتے ہیں بلکہ اردو کے مستقل جملے اور اشعار بھی میسر آتے ہیں۔ امیر خسرو کی مختلف تصانیف میں ہمارے الفاظ بکثرت ملتے ہیں۔ مثنوی قران السعدین جو آٹھویں صدی ہجری کے شروع ہونے سے بارہ سال پہلے لکھی گئی ان الفاظ کی حامل ہے:۔

چبوترہ۔ ساغر (ساگر= حوض یا تالاب) عوض۔ (اودھ)۔ راوت (راجپوت) پایک (پیادہ) پگ۔ بالا۔ کیورہ۔ سیوتی۔ بیل۔ مولسری۔ تنبول۔ بیرہ۔ گلِ صد برگ (ہزارہ)۔ چونہ۔ بنگ۔ بلادر۔ وغیرہ[1]۔

دوسری مثنوی مطلع الانوار میں بھی کئی لفظ ملتے ہیں۔ مثلاً علی گڈھ (۱۳۲۴ھ) والے ایڈیشن میں یہ ہیں:۔

بیلکش از پیکرِ چوں بید برگ — فتنۂ پروردہ بجلاّبِ مرگ (ص ۲۵)

دشمنِ ناچیز بہنجار کُشش — پشّہ بسیلی نہ بہ چقمار کُشش (ص ۱۵۶)

(ایک گرز)

---

[1] اورینٹل کالج میگزین۔ نومبر ۱۹۳۹ء ص ۹

تیسری مثنوی "شیریں وخسرو" ۶۹۸ھ میں لکھی گئی۔ علی گڈھ کے ۱۳۴۶ھ والے ایڈیشن میں مرتب صاحب کے خیال کے مطابق اِن اشعار میں ہمارے محاورے ملتے ہیں:-

بنامیزدِ میانِ خاصۂ وعام ۔۔۔ نکوناید حرام وحرمت نام (ص۵۷)

بگردِ تختِ خوبانِ سرائی ۔۔۔ زچہرہ دادہ شب را (ناروا) روشنائی (ارجمندی) (ص۸۰)

"زنبورک" بھی ہندی تیراندازی کی چیز ہے۔

زتیراندازیِ زنبورک از دور ۔۔۔ مشبک سینہ ہا چوں خانہ زنبور (ص۶۴)

امیر خسرو کی خزائن الفتوح (۷۱۰ھ) میں بھی یہ الفاظ ملتے ہیں:-

دھانک (تیرانداز)۔ گھَٹی (درّہ)۔ بسیٹھ (ایلچی)۔ مار مار۔

دیول رانی خضر خانی (۷۱۵ھ) میں یہ الفاظ ہیں:-

رانی۔ رانہ۔ لادی (بوجھ۔ باربردار)۔ پٹولہ (پٹولا۔ ریشمی کپڑا) رائے چنبہ۔ مَولسریِ۔ سیوتی۔ دَوَنہ (پھول)۔ سُکھ آسن (پالکی)۔ الاون یا الاین (ایک ساز) تال۔ تنگہ۔ ڈولہ۔ [۱]

بعض بیاضوں میں یہ شعر بھی خسرو کی طرف منسوب ہے جس میں "ماموں" اور "ممانی" کی رعایت ہے:-

گفتم گہے درخانۂ ماموںِ توباشم ۔۔۔ گفتا کہ دریں خانہ بلائیست ممانی [۲]

خسرو کا ایک اور شعر ہے:-

بلبل ازیں غصہ چناں خوں نشست ۔۔۔ کز تہِ دُم رنگِ دگر گونہ بست

---

[۱] اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۲۹ء ص۹ [۲] ایضاً بابت مئی ۱۹۲۹ء ص۶

بقول صاحب بہارِ عجم "خون نشستن" دراصل ہندی محاورے کا ترجمہ ہے۔ اس شعر سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہاں کے پرند گُلدُم کو امیر خسرو نے بلبل ہی کہا ہے ان الفاظ کے علاوہ خسرو کے اردو اشعار بھی ملتے ہیں۔ خالق باری تو اُن کی نہیں ہے لیکن حافظ محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" (صفحہ ۱۲۵-۱۲۷) میں ان کا کلام نقل کیا ہے۔ ایک غزل بھی نقل کی ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے:-

جب یار دیکھا نین بھر دل کی گئی چنتا اُتر ایسا نہیں کوئی عجب راکھے اُسے سمجھائے کر

اور اس کا مقطع یہ ہے:-

خسرو کہے باتاں غضب دل میں نہ لاوے کچھ عجب قدرت خدا کی ہے عجب جب جیو دیا گل لائے کر

قاضی فضل حق صاحب نے اورینٹل کالج میگزین (مئی ۱۹۳۷ء ص ۹۵) میں امیر خسرو کی جو غزل نقل کی ہے اس کا مقطع بھی اسی طرح ہے:-

خسرو کہے باتاں عجب دلبر نہ پاوے اک قدر قدرت خدا کی یہ عجب میں جی دیا پر لائے کر

ہمارے پاس ایک بیاض میں ریختہ کے کچھ اشعار ملتے ہیں جو اسی غزل سے متعلق معلوم ہوتے ہیں۔

تا کے خورم خونِ جگر کا سوں کہوں دکھ جائے کے
شورے فتادہ در تنم پی دے گئے سر کائے کے
ہر چند گفتم ایں سخن اے دل بکس رغبت مکن
ان کی برہ ہے ات کٹھن بھوتا رہے سمجھائے کے
از دردِ تو بے جاں شدم طاقت نماندہ در تنم
کے پیت دے آوان کرو کے موہ لیو مولائے کے

امیر خسرو کی کہہ مکرنی، انمل، دوسخنی، گیت اور پہیلی کہاں مشہور نہیں؟ لیکن یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایسے کلام میں سے کس قدر اُنہی کا ہے۔ البتہ ملّا وجہی نے سب رس (سنہ ۱۰۴۵ھ) میں اُن کا ایک دوہا (ص ۲۱۸) نقل کیا ہے اسے ان کے کلام کا ایک قدیم مأخذ قرار دیا جا سکتا ہے۔ وہ دوہا یہ ہے :-

پنکھا ہو کر میں ڈلی ساتی تیرا چاؤ　　　مُنجھ جلتے جنم گیا تیرے لیکھن باؤ

امیر خسرو کے پیر حضرت نظام الدین اولیاء علیہ الرحمہ کے فارسی ملفوظات میں جو "فوائد الفواد" کے نام سے موسوم ہیں بعض اردو الفاظ بلا تکلف آگئے ہیں مثلاً پیاز۔ لنگوٹہ۔ کھٹ۔ چھجہ۔ لنگھن۔ لٹ وغیرہ[1]

سیر الاولیاء جو حضرت موصوف اور ان کے خلفاء اور معاصرین کے متعلق ہے سنہ ھ میں سید محمد ابن سید مبارک کرمانی نے لکھی ہے۔ اس میں بھی بہت سے الفاظ ہیں۔ مثلاً: چنڈوگھر۔ چوترہ۔ ڈولہ۔ بھوگا (عیش)۔ جواری (جوار) درخت بڑ۔ بھاگسی (قید۔ قید خانہ) چھپری۔ چھپردار۔ تلخ کریلہ۔ لنگھن۔ کھٹ۔ عورت (بیوی) خوش بمعنی مسرور جو اردو کا لفظ ہے۔ (فارسی میں اس کے معنی مرغوب و پسندیدہ ہیں۔)[2]

---

[1] نقوش سلیمانی۔ ص ۴۴۔ [2] اورینٹل کالج میگزین۔ نومبر سنہ ۱۹۲۹ء ص ۱۹ - ۲۰۔

خسرو کے اور اشعار بھی بعض کتابوں میں آتے ہیں۔ مثلاً :-

خسرو رین سہاگ کی سوئی پی کے سنگ　　　تن مورا من پیو کا دونوں ایک ہی انگ

یہ انہی کے شعر کا مترادف ہے کہ: ع من تن شدم ... الخ

اپنے شیخ کے انتقال پر کہتے ہیں :-

گوری سووے سیج پر مکھ پر ڈالے کیس　　　چل خسرو گھر آپنے رات بھئی چہوندیس

فیروز شاہ تغلق (المتوفی ۷۹۰ھ) کو قلعۂ کانگڑہ کی فتح کے وقت جو کتب خانہ ملا تھا۔ اس میں ایک کتاب باراہی بھی تھی۔ اس میں مہینوں اور نتھوں کے ناموں کے علاوہ یہ الفاظ بھی ہیں:۔ کٹارہ۔ تھل (زمین) جوگی۔ کھتری۔ موٹھ۔ مُنگ۔ (مونگ) وغیرہ۔[۱]

آٹھویں صدی ہجری کے بزرگ حضرت یوسف چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے صاحبزادے حضرت ابوالفتح گیسو درازؒ کے لیے ۷۹۵ھ میں ایک مثنوی "تحفۂ نصائح" (۷۸۶) اشعار کی لکھی تھی۔ اس میں ایک شعر یہ ہے:۔

کردم ہوس چوں زاغہا رفتار کبکاں چوں کنم
برباد شد رفتارِ من گشتم خجل ہم منکسر

میرا خیال ہے کہ یہ اردو محاورہ "کوّا چلا ہنس کی چال الخ" کا ترجمہ ہے۔ قطبی (رازی) نے ۸۴۵ھ میں اسی مثنوی کا جو دکنی منظوم ترجمہ کیا تھا اس میں اس شعر کا ترجمہ یہ ہے:۔

جیوں کی ہوس کیتا کوّا جو چال ہنس کی ہیں چلوں
اڑگئی او اپنی چال بھی تیوں ہوں خجل حیران تر

ریاست ٹونک کے کتب خانے میں داستانِ امیر حمزہ کا جو نسخہ[۲] ہے وہ بھی آٹھویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔ اس میں شمستن بمعنی نشستن ملتا ہے۔ حرکت بمعنی شرارت بھی آتا ہے جو شمس سراج عفیف[۳] کے یہاں بھی ہے۔ گذشت ہر موقع پر

---

[۱] اورینٹل کالج میگزین۔ نومبر ۱۹۲۹ء ص ۴۳
[۲] علامہ شیرانی کے توسط سے اس کا استفادہ کیا تھا۔
[۳] مثلاً "باما آں قلندران حرکت کردہ لشکر یارا بہ تعبیہ اندرون حصار بیرون آوردہ" (ص ۱۵)

"گدشت" (دال مہملہ کے ساتھ) مرقوم ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ نسخہ کسی ایسے نسخے سے منقول ہے جو مغلوں سے قبل تحریر ہوا تھا۔ اس کی داستانِ دوم میں جیتل کا لفظ آتا ہے جو بقول شیرانی صاحب[۱] کے آٹھویں صدی ہجری میں زیادہ رائج تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے الفاظ و محاورات بھی ملتے ہیں۔ مثلاً اسی

داستانِ دوم میں ہے:۔

"وزیر حیران شدہ بماند۔"

"بخوشی و خرمی گدرانیدند۔"

"درخانہ امیدواری[۱] شدہ است۔"

"درتمام عمر تنگہ بدست ما نبود۔"

داستانِ پنجم میں ہے:۔

"و عمرو از غصہ[۲] می جوشید و در دل می بود کہ معلم را چہ حرکت دہد۔"

"چوں در حویلی رسیدند شور و شر در شہر مکہ افتاد۔"

"بیا تا ما در عقبِ ایشاں شدہ برویم۔"

"و عقب برادراں شدہ می رفتند۔"

داستانِ ششم:۔

"پس عمرو تفک بکشید و غلولہ در دہاں انداخت و بر چشم سوار آں چناں زد کہ یک چشم کور کرد۔" کاغد (دالِ مہملہ)۔

---

[۱] پنجاب میں اردو۔ ص ۱۳ — [۲] ضیاء برنی (۵۱۳) نے بھی لکھا ہے:۔
"درآں ایام غصۂ سلطان محمد بر خلق بیشتر بود۔"

"امیر تمام حرکتِ او دریافت" ــــ "گفت اے عمرو دیدی بکدام حرکت شاہاں را ہیجان می کند" ــــ "نگداشت" (نگذاشت)

داستانِ دہم :-

"نوشیرواں بغایت خوش شد"[1]

"معلق زدو سر بر زمیں آورد"

داستانِ دوازدہم :-

"ترا یک لک تنگہ می دہم"

"شاہِ مغلستان ست"

داستانِ چہاردہم :-

"بر در پاے یک دیگر افتادند" (پاؤں پڑنا) -

"موازنۂ یک کروہ از لشکر عقب فرود آمدہ است"

داستانِ شانزدہم :-

"از ہیبت آں سرش بگشت" (سر کا چکر میں آنا)

"ناوک و ناچخ و عرادہ و منجنیق می گداشت (دال مہملہ)"

"در کنارۂ آں حوض یک چھپرے یافت"

"نوشیرواں ہر ابراے حرکت فرستادہ است"

"ملاحاں در دریا آمدند جنگہا کشیدند" (جنگ کشتی)

"امیر بطالعِ سعد خود با جملہ گرداں در یک جنگ بنشست و لشکر در جنگہاے دیگر بنشست"

---

[1] سیر الاولیا، (ص ۱۶) "بغایت خوش شد"

"وگفت اے شکم بزرگ مردے پُرحرکتی" "زباں می داد"

"ولشکر امیر را برچھہ و نیر می زدند" (برچھا)

"وکسوتِ جوگیاں کرد" (جوگی)۔

"چوں حمزہ التماسِ کارِ خیر کند چہ جواب دہم" (کارِ خیر بمعنی نکاح)۔

یہ تو خیر فارسی کتابیں تھیں جن میں ہماری زبان گھر کیے ہوے ہے لیکن عربی کتابوں میں بھی یہی حال ہے۔ چنانچہ مسعودی، اصطخری اور البیرونی کی طرح ابن بطوطہ نے بھی (جو ۷۳۳ھ میں ہندوستان آیا) اپنے عربی سفرنامہ میں ہمارے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ مثلاً ٹٹو۔ منڈی۔ ڈولہ۔ کہار۔ کنگھر۔ کشری (کھچڑی) جوتری (چودھری) جوکیہ (جوگی)۔ قطارہ (کٹارہ) وغیرہ متعدد الفاظ تعریب کے ساتھ اس کے یہاں آتے ہیں۔

آٹھویں صدی ہجری اور اس سے پہلے کے بزرگوں کے ملفوظات میں سے اردو الفاظ و فقرات کے متعلق پروفیسر شیرانی مرحوم، مولوی عبدالحق اور حکیم شمس اللہ قادری وغیرہ بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ ان کے علاوہ اس دور کی تین لغات بھی بہت شہرت رکھتی ہیں۔ یعنی بحر الفضائل (۷۹۵ھ / ۱۳۹۲ء) ادات الفضلاء (۸۲۲ھ / ۱۴۱۹ء)۔ اور شرف نامہ (۸۵۲ھ / ۱۴۴۸ء)۔ پھر چوتھی لغت موید الفضلاء (۹۲۴ھ / ۱۵۱۸ء) بھی بہت اہم ہے۔ ان لغات میں ہماری زبان کے الفاظ جہاں فارسی تحریر میں اپنا اثر بتا رہے ہیں وہاں یہ بھی ظاہر کر رہے ہیں کہ ان کے مؤلفین نے اردو کے عام رواج کی وجہ سے اردو میں بھی سمجھانے کی کوشش کی ہے تاکہ اگر کوئی شخص فارسی میں نہ سمجھ سکے تو اردو میں ضرور سمجھ لے۔

نویں صدی ہجری کی ایک کتاب مفرح القلوب حافظ محمود شیرانی مرحوم کو ملی تھی۔ اس میں یہ الفاظ ہیں :۔

درختِ باکھر۔ جوگی۔ کھبر (پیالہ۔ رکابی)۔ نہال گردیدن (نہال ہونا)۔ لنگوتی۔ چھتر (چھتری)۔ کاہل (بزدل)۔ متھرک (حرکتیں کرنے والا۔ چال باز)۔ غروری۔ منغصی (منغّض)۔ وغیرہ۔ اسی طرح اردو کا فعل "رہنا" بھی "ماند" کی شکل میں آتا ہے۔ مثلاً۔ بے خبر افتادہ ماند (بے خبر پڑا رہا)۔ ایستادہ شدہ ماند۔ (کھڑا کا کھڑا رہا) وغیرہ۔ سلہ

اسی دور کے آخر میں ملا حسین واعظ کاشفی (المتوفی سنہ ۹۱۰ھ / ۱۵۰۴ء) سلہ نے انوار سہیلی لکھی۔ اس میں بھی ایک دو لفظ ہمارے ملک کے استعمال ہوئے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ جب رائے دابشلیم اپنی منزلِ مقصود پر پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ "آں مسکنِ حکیمے است کہ او را بید پلے خوانند یعنی طبیبِ مہرباں۔ واز اکابرِ ہند استماع افتادہ کہ نامِ او پیل پلے است کہ بہ ہندی ہتی پات خوانند"۔ یہ کتاب ہندی الاصل ہے اس لیے اس میں ایسے الفاظ کا استعمال ہونا تعجب کی بات نہیں ہے۔

بہر حال یہاں تک نویں صدی ہجری کی ان فارسی کتابوں کا ذکر آجاتا ہے جن پر اردو نے اپنا قبضہ جما رکھا تھا۔ اب ہم دسویں اور گیارہویں صدی ہجری

سلہ اورینٹل کالج میگزین۔ نومبر ۱۹۲۹ء ص ۲۵-۲۸۔

سلہ کاشفی کے بیٹے علی بن حسین نے رشحات عین الحیات (سنہ ۹۰۹ھ) میں اپنا لقب یا تخلص صفی لکھا ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ مولانا عبد الحق نے قصہ چہار درویش کے ماخذ کے سلسلے میں جس صفی کا ذکر کیا ہے وہ یہی ہوں۔ کیونکہ وہ بھی مذہب و اخلاق کے قصوں میں دلچسپی لیتے تھے۔

میں داخل ہوتے ہیں جب کہ فارسی کے بڑے بڑے شعرا بھی ہماری زبان کے محتاج ہوئے۔ اور فیضی اور ابوالفضل کے علاوہ وہ لوگ بھی اردو سے متأثر ہوئے جو ہمارے ملک میں نو وارد تھے۔

چوتھا دور:۔ دسویں اور گیارہویں صدی ہجری (یعنی سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی)۔

اس دور کے شروع ہوتے ہی مذہبی پیشواؤں کے علاوہ دنیوی حاکموں اور ان کے وابستگان سے ہمیں زیادہ واسطہ پڑتا ہے۔ یعنی ہمیں عہدِ مغلیہ کی فارسی کا جائزہ لینا ہے۔ یہ دور ایسا ہے کہ اس میں اردو کا صحیح اور عام رواج پایا جاتا ہے اور وہ رواج ایسا ہے کہ جس کے سامنے فارسی سکوں کا چلن گھٹ گیا۔ بلکہ بابر کی توزک جو ترکی میں تھی وہ بھی ہماری اردو کی محتاج ہوئی۔ اور ہاتھی، پان، پنکھا، جامن، کمرک، کیوڑا، کیلا، کروندا، چرونجی، گلہری، مور وغیرہ الفاظ نے اس کی زینت بڑھائی۔

جنگ پانی پت (۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء) میں جب بابر نے سلطان ابراہیم لودی کو شکست دی تو کسی نے فی البدیہہ یہ اشعار پڑھے:۔

نو سے اوپر تھا بتیسا،	پانی پت میں بھارت ویسا
اٹھئیں رجب شکروارا	بابر جیتا، براھم ہارا

پھر بابر کا وہ شعر بھی ہے جس میں ترکی اور اردو الفاظ ہیں اور جس کو ای ڈینی سن راس (E. Denison Ross) (دیوانِ بابر بادشاہ۔ جلد ششم ۱۹۱۰ء جرنل ایل ایشیاٹک

سلے یعنی جمعہ ۸ رجب ۹۳۲ھ مطابق ۲۰ اپریل ۱۵۲۶ء، عالمگیر خاص نمبر ۱۹۳۵ء ص ۳۵۔

سوسائٹی آف بنگال) کے بعد مولانا عبدالحی صاحب نے بھی گلِ رعنا میں نقل کیا تھا۔ یعنی ؎

مجکا نہوا کچ ہوسِ مانک و موتی　　　فقرا ہلیغہ بس بولغو سید و رپانی روتی

بابر کے دو شعر اور ہیں جن میں اردو الفاظ ہیں:۔

بسیرا بہ باز آر آن کوفتہ　　　بسی را بہ بازار آن کوفتہ

چو یا دے چو ما بتلائے توایم　　　بہ ہندوستان از برائے توایم[۱۵]

اسی کے ساتھ ۹۴۲ھ/۱۵۳۵ء میں رومی خاں والیٔ گجرات پر توتے کا طنز بھی یاد آتا ہے۔

اسی زمانے میں مولانا جمالی (المتوفی ۹۴۲ھ) جو مولانا جامی اور جلال الدین دوّانی (صاحبِ اخلاقِ جلالی) سے ملاقات کا شرف حاصل کر چکے تھے اپنی کتاب سیر العارفین میں جگہ جگہ اردو کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً[۱۶]

صفحہ ۱۴۱ میں ہے:۔ "۔ ۔ ۔ روزے حضرت شیخ المشائخ بہاء الملۃ والدین قدس سرہٗ بر پلنگے تکیہ فرمودہ بودند و دستارِ مبارک خود بر پایۂ پلنگ نہادہ۔ ۔ ۔" (پلنگ)

صفحہ ۱۷۳ میں یوں ہے:۔ "۔ ۔ ۔ در خطۂ ناگور عورتے بود صالح، ارادت بہ حضرت ملک المشائخ داشت۔ ۔ ۔" (عورت)

صفحہ ۱۷۴ میں ہے:۔ "۔ ۔ ۔ چوں در آمدم دیدم کہ بر تخت نشستہ اند و طبقے از طعام کھچری بہ پیش نہادہ تناول می فرمایند۔ ۔ ۔" (کھچڑی)

اور صفحہ ۱۸۲ میں ہے:۔ "حضرت شیخ را بچشمِ سر معاینہ نمودم۔ گوئی بہ بہشتے تمام

---

[۱۵] اسلامک کلچر (حیدرآباد دکن) جنوری ۱۹۵۱ء

[۱۶] مطبوعہ لکھنؤ۔ سال طباعت درج نہیں۔ راقم کی کتاب علمی نقوش (صفحہ ۹۷۔ کراچی ۱۹۵۷ء) میں حضرت شیخ وجیہ الدین علویؒ (۹۹۸ھ/۱۵۸۸ء) کے ملفوظات پر مضمون ہے۔ ان ملفوظات میں بکثرت اردو فقرے آتے ہیں۔

بیرہ برگِ تنبول بدستم می دہند" (بیڑا تنبول)۔

طب کی ایک قدیم کتاب "کفایۂ مجاھدیہ" (مؤلفہ منصور ابن محمد ابن یوسف ابن الیاس) میرے ایک دوست ڈاکٹر سید محمد سعید صاحب کے یہاں دیکھنے میں آئی۔ وہ ۹۶۳ھ میں نقل ہوئی تھی۔ اس لیے اس سے پہلے اس کی تالیف ہوئی ہوگی اس میں بعض ہندوستانی طبی لغات کا ذکر آتا ہے:۔

پنیر (ق ۱۸۱-و)۔ امرود (ق ۱۸۲-و)۔ جوز ہندی (نارجیل۔ ق ۱۸۳-و)۔ ہندوانہ (ق ۱۸۳-ب)۔ گزر (گاجر۔ ۱۸۴-و) جند بیدستر (۱۷۷-ب)۔ ق ۱۹۴ ب میں یہ الفاظ ہیں:۔ اطریفل یشیطرج ہندی۔ بلادر۔ فلفل۔

ایک اور طبی کتاب موصوف کے پاس دیکھی اس کا نام تحفۃ المومنین (مولفہ محمد مومن ابن میر محمد زماں دیلمی) ہے۔ وہ عباس شاہ ثانی (م ۱۰۷۷ھ / ۱۶۶۶ء) کے لڑکے صفی مرزا الملقب "سلیمان شاہ" کے زمانے میں لکھی گئی ہے۔ اس میں طبی لغات کی فہرست میں ہندوستانی الفاظ بکثرت ملتے ہیں۔ مثلاً

آٹا[1] (آٹا) بہندی۔ اسم سویقے است۔

آہوائی۔ بہندی۔ خردل است۔

آگ۔ بہندی۔ آتش است

اتیل۔ بہندی۔ فرنج مشک است

ابرک۔ بہندی۔ طلق است۔

---

[1] "ٹ" کے علاوہ دوسرے حروف کے رسم الخط وغیرہ کے لیے راقم الحروف کا مضمون "اردو املا کی تاریخ" معارف (جون ۱۹۵۱ء) ملاحظہ فرمائیں۔

اُنگن۔ بہندی۔ انجرہ است

اجمود۔ بہندی۔ کرفس است

اجوائن۔ بہندی۔ نانخواہ است

اُجلاچندن۔ بہندی۔ صندل ابیض است

اکرکرہا۔ بہندی۔ عاقرقرحا۔

اجوائن۔ بہندی۔ بریخ است

اجولا۔ بہندی۔ فودنج برّی است

ارنڈ۔ اُلق است

ارندی۔ بہندی ضریح است

اکتمکت[1]۔ بہندی۔ اسم سنگے ست

اکروٹ۔ بہندی۔ جوز است

السی۔ بہندی۔ بزرِکتان

الائچی۔ بہندی۔ قاقلہ

اَنبلج[2]۔ بہندی۔ ثمر درختِ ہندی

آملہ سار۔ بہندی۔ گوگرد

اندراین۔ بہندی حنظل است

آنولہ۔ بہندی۔ ایلج

اندرجو۔ بہندی۔ لسان العصافیر

---

[1] ہمارے ملک کی طب میں یہ نام کرنجوہ کے لیے آتا ہے۔ [2] یہ نام آنولا کے لیے آتا ہے۔

اہلیلج ہندی۔ رسود نیز نامند۔

اہیم۔ بہندی۔ حرمل است

ایلوا۔ بہندی۔ صبر زرد است

ایزم ساز۔ بہندی۔ بابورنج است

اکبری عہد میں علاقۂ سندھ کے ادراکی شاعر نے بیگلار نامہ لکھا تھا جو سندھی ادبی بورڈ کراچی نے شائع کیا ہے۔ اس میں بکثرت الفاظ ہماری زبان کے مستعمل ہیں :۔

"طاقتِ مقاومت نیاوردند وہزیمت نمودہ تحصن بہ جنگل بردند۔" (ص ۳۳)

یہ لفظ جنگل اسی کتاب میں صفحہ ۹۸، ۱۰۳، ۱۴۹، ۱۶۹ وغیرہ پر بھی آتا ہے۔

چابک (کوڑا) آتا ہے :۔ "دو سہ چابک بر تنِ مبارکِ خود زدہ خود را متنبہ ساخت۔" (ص ۶۶)

گونی (Gunny bag) بھی مستعمل ہے (جو فارسیِ جدید میں بھی رائج ہے) :

"ما یک گونیِ غلّہ از خوف لشکر در جائے نہان ساختہ ایم، اگر کسے ہمراہ باشد گونیِ غلّہ آوردہ شود۔" (ص ۱۰۵) یہی لفظ صفحہ ۱۳۷ پر بھی آتا ہے۔

کشتیِ لاہرہ بھی آتا ہے :۔ "متحیّر و متفکّر شدند کہ کشتیِ لاہرۂ نواب از سر کشتیہا چگونہ ممیّز خواہیم ساخت۔" (ص ۱۱۰)

عورت (بمعنی زن) بھی مستعمل ہے :۔ "دو عورتِ خدمتگار در کشتی نشستہ۔" (ص ۱۱۱) صفحہ ۱۳۴ پر بھی یہ لفظ آتا ہے۔

اسی کتاب میں بکثرت مقامات پر دلاسا (استمالت) استعمال ہوا ہے۔ مثلاً صفحہ ۳۹، ۱۱۸، ۱۳۰، ۱۵۰، ۱۷۰ وغیرہ۔ ایک مثال دیکھیے :۔ "آنجا رسیدہ بہ ایشان استمالت و دلاسا نماید۔" (ص ۱۵۰)۔

محمد ہاشم کشمی علیہ الرحمہ کی کتاب زبدۃ المقامات میں ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ (م ۱۰۳۴ھ) نے جن کی مادری زبان فارسی تھی وصال کے دن یہ مصرع بار بار پڑھا تھا:۔ ع آج ملاوا کی سُنی سکھی، سب جگ دیو وار۔

حضرت مجدد قدس سرہٗ کے صاحبزادے حضرت خواجہ محمد معصوم قدس سرہٗ کے فارسی مکتوبات (جلد سوم۔ مکتوب اول) میں یہ مصرع آتا ہے:۔ ع

چونے کی سی کانکری جب چھڑکوں تب آگ

اکبر سے لے کر شاہجہاں اور اورنگ زیبؒ کے عہد تک ہمیں ایسے فارسی نژاد شعراء ملتے ہیں جن کے کلام پر ہماری اردو نے بہت زیادہ اثر کیا، اور ان کی فہرست میں کم از کم حسب ذیل ضرور قابلِ توجہ ہیں:۔

عرفی (المتوفی سنہ ۹۹۹ھ / ۱۵۹۰ء)۔ ظہوری (المتوفی سنہ ۱۰۲۵ھ / ۱۶۱۶ء)۔ محمد قلی سلیم (المتوفی سنہ ۱۰۵۷ھ / ۱۶۴۷ء) کلیم (المتوفی سنہ ۱۰۶۱ھ / ۱۶۵۱ء)۔ ملا طغرا مشہدی (المتوفی سنہ ۱۰۷۸ھ / ۱۶۶۷ء) صائب (المتوفی سنہ ۱۰۸۰ھ / ۱۶۶۹ء) ملا سعید اشرف مازندرانی (المتوفی سنہ ۱۰۸۳ھ / ۱۶۷۲ء کے بعد) سالک یزدی (المتوفی سنہ ۱۰۸۱ھ / ۱۶۷۰ء) سنجر کاشی (المتوفی سنہ ۱۰۲۱ھ / ۱۶۱۲ء) مسیح کاشی (المتوفی سنہ ۱۰۶۶ھ / ۱۶۵۵ء) میرزا نظام (المتوفی سنہ ۱۰۳۹ھ / ۱۶۲۹ء) میرزا محسن تاثیر (المتوفی سنہ ۱۱۳۰ھ / ۱۷۱۸ء) وحید، خواجہ عصمت بخاری، حکیم ہمام وغیرہ وغیرہ

مغلیہ دور کی شعر نوازی نے جس طرح ایران کے بڑے سے بڑے شاعر کو ہندوستان کا گرویدہ بنا لیا، اور یہاں آنے پر مجبور کر دیا۔ اسی طرح ان بادشاہوں کے مذاق کا لحاظ کرتے ہوئے ان شاعروں کو بھی ہماری زبان کے الفاظ استعمال کرنے پر بھی بالواسطہ مجبور بنا دیا۔ کیونکہ ان بادشاہوں نے جب ہندو رانیوں سے شادیاں کیں تو یہ ضرور ہے کہ ان کی زبان بھی پسند کی ہو گی اور جب انھوں نے اس

زبان کو مُنہ لگایا تو ظاہر ہے کہ ان شاعروں کے لیے بھی وہ ناگزیر تھی۔ چنانچہ ان کے یہاں بے شمار ہندوستانی (اردو) الفاظ پائے جاتے ہیں، جن کو ہم مختلف عنوانات کے تحت تقسیم کرتے ہیں:۔

(۱) عیش و طرب کے لوازمات

اس عنوان کے متعلق بحث کرتے ہی سب سے پہلے "معشوق" کا ذکر ہونا چاہیے کیونکہ بغیر اس کے "عیش و طرب" کا لطف ہی نہیں، اردو شاعری میں معشوق کے حُسن کو سنہرے رنگ سے تشبیہ دیتے ہیں، جیسے ولی کا شعر ہے:۔

شکل تجھ بُت کی جو مجھ دل میں ہوئی ہے منتقش
ہے سمندر کی نمط آتش میں تصویر طلا[۱]

یا ذوق کا شعر ہے:۔

مصحفِ رُخ پہ ترے، رنگ سنہرا تیرا   واہ کیا خوب ہی سونا سر قرآن چڑھا

لیکن یہ "رنگِ طلائی" فارسی شعراء کے یہاں ہمیشہ "عاشق" کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ہماری اردو کا اثر دیکھیے کہ محسن تاثیر جو بقولِ آرزو ہندوستان بھی نہیں آئے، معشوق کے رنگ کو یہاں سے اُڑا لے گئے:۔

آں رنگِ طلائی خطِ مشکیں خواہد
ہر جا گلِ جعفریست ریحان است[۲]

پھر معشوق کے "سنگار" کے متعلق سعید اشرف کہتے ہیں:۔

آنرا کہ ہمیں کار بہ سنگار بُود   با سنگرِ افغاں چہ تواند کردن

۱؎ کلیاتِ ولی ص ۳۹۔ ۲؎ چراغِ ہدایت۔

اور "سولہ سنگار" کا ذکر امیر خسرو کے یہاں یوں آتا ہے:-

چوں شدی بہرِ ہفت و نو دہ رنج　　　نقدِ عصمت فتاد در شش و پنج [1]

جب معشوق ہوگا تو اس کے "جال" میں کون نہ پھنسے گا:-

گہے مفتونِ زلفش گہ گرفتارِ زنخدانش
اگر از چاہ بیروں آمدم در جالہ افتادم [2]

جب معشوق کا ذکر آیا تو شاعر کے لیے بلبل کی یاد ضروری ہے۔ چنانچہ ہندوستان میں بلبل کی قائم مقام "مینا" کو سمجھ کر زورِ قلم صرف کیا ہے۔ شاہد گیلانی کہتے ہیں:-

شعلہ در سایۂ زلفت گلِ شبّو گردد
بطِ مے پیشِ تو مینائے سخن گو گردد [3]

ملا طغرا مشہدی نے "مینا" کے "راگ" کو بھی پسند کیا ہے:-

موسم آں باشد کہ مینا راگِ ہندی سر کند
شاخ و برگِ نغمہ را از آبِ ترنّم تر کند

اور محسن تاثیر بھی کہتے ہیں:-

مگر از شیوہ ہائے راگ و رنگش　　　برقص آرد فلک را ساز چنگش

طغرا "گیت" کو نہیں بھولتے:-

بود گیت نزدِ طرب سنج رود　　　دریں کشورِ ذوق نام سرود

اسی موسیقی کے ساتھ ستار کے مہمل الفاظ "تانی تنہ" بھی میر ہمام یاد کرتے ہیں:-

دانستنِ معرفت بہ تانی تنہ نیست　　　اثباتِ ظہور ذات را بینہ نیست [4]

سلہ مثنوی ہشت بہشت صہ ۲۵ لکھنو ۱۹۰۹ء سلہ محسن تاثیر - سلہ منتخب النفائس ف ۱۶۰ سلہ چراغ ہدایت

جب ساز اور راگ کا ذکر آیا تو "مندل" بھی ہونا چاہیے، جو بقول صاحب رشیدی ایک قسم کا ہندوستانی ڈھول ہے، ملا طغرا کہتے ہیں:۔

چو مندل پا نہد در بزم نغمہ   نیا بد دف سرِ مو جا ازیں ساز

اسی سلسلے میں ابراہیم عادل شاہ بیجاپوری کا "طنبورہ" موسوم بہ "موتی خاں" نہ بھولیے سنجر کاشی ایک قصیدہ میں کہتے ہیں:۔

روا ست کورنش و تسلیم ازاں بہ موتی خاں

کہ شاہ چوں خلفا نشس گرفتہ در دامن

اور خود "طنبورہ" بھی بقول صاحب بہار عجم "تونبڑہ" کا معرب ہے۔

"سازوں" میں "صنج" کو بھی نہ بھولنا چاہیے، جو ص اور ج کی موجودگی کی وجہ سے عربی الاصل نہیں ہو سکتا، لیکن بقول آرزو "چنگ" کا معرب[۱] معلوم ہوتا ہے۔ اور معنوی حیثیت سے ضرور ہندوستانی "جھانج" کا معرب ہے۔ ان سازبازی کے ساتھ "شطرنج" بھی آجاتا ہے، جو اگر فارسی "سترنگ" کا معرب ہو سکتا ہے تو ہندی "چترانگ" کی بھی شکل ہونے میں شک نہیں، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ راوندی کی راحت الصدور (۱۲۱۱ھ) میں صصبہ بن داہر الہندی کو شطرنج کا موجد کہا گیا ہے[۲]۔

عیش و طرب کے لوازمات میں شاعروں کے یہاں "پینا" اور "کھانا" بھی ضروری ہے، چنانچہ اگر گلابی کی تعریف صائب[۳] کے یہاں ہے:۔

مے کشاں را بادۂ گلرنگ خنداں می کند   یک گلابی مجلس ما را گلستاں می کند

---

[۱] چراغ ہدایت ۔ [۲] رسالہ عالمگیر خاص نمبر ۱۹۳۵ء میں "تاریخ شطرنج" ایک مفصل مضمون مولانا ابو یوسف سنجی مرحوم کا نکلا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ صصبہ کے بجائے صیصہ زیادہ بہتر ہے۔
[۳] صائب کا ایک قصیدہ "بسنت" ردیف میں ہے۔

تو اس ہندوستانی شراب کی مذمت بھی انھوں نے کی ہے جو غالباً گُڑ سے بنائی جاتی تھی:-

بادۂ انگور و آبِ خضر از یک چشمہ است
مُردہ دل در سینہ اش ہر کس شرابِ گور خورد

اسی طرح "دارو" کے صحیح معنی اگر "باروت" بھی ہیں، مثلاً بندوق کے متعلق وحید کہتے ہیں:-

نماید حکیم مسیحا علاج ۔۔۔ زدارو ے او دشمناں را علاج

تو اسی "دارو" کے معنی "شراب" بھی لیے گئے ہیں جو خالص اردو لفظ ہے۔ سعید اشرف ایہام کے ساتھ کہتے ہیں:-

زمستی بود بیکرش نرم و صاف ۔۔۔ کہ از میکشی کردہ دارو کشی

اسی شراب کے ساتھ ہندوستان کی صراحی "چھاگل" بھی ظہوری لے آتے ہیں:-

مہوشانِ چگل بفخر کشند ۔۔۔ چاگلِ من نیاید از عارم

ملا طغرا مشہدی اپنے ساقی سے کہتے ہیں:-

بیا ساقی امشب عرق کن بجام ۔۔۔ کہ از تندیش غم نگیرد مقام
بشرطیکہ باشد عرق از شکر ۔۔۔ کز و نیست میخوارہ را دردِ سر

وحید بھی اسی دیہاتی شراب کی یاد کرتے ہیں:-

ریخت زعکسِ لعلِ تو اشک زچشمِ تر مرا ۔۔۔ مست نمود بے خبر ایں عرقِ شکر مرا

لیکن صائب کی رائے اس کے متعلق یہ ہے:-

عرق بپای گوہر کجا چو بادہ بود ۔۔۔ حرام زادہ کجا چوں حلال زادہ بود

اس "پینے" کے ساتھ کچھ "کھانا" بھی چاہیے۔ عالمگیر نے یہاں کی کھچڑی کی تعریف اپنے کلماتِ طیبات (گلِ رعنا) میں کی ہے، لیکن ان سے پہلے سالک یزدی بیزار ہو کر کہتے ہیں :-

سیر گشتم ز کھچریِ ایام　　　هوسِ خوانِ سیم و زر نکنم

لیکن "شراب" کے ساتھ "کباب" ہی ہونا چاہیے۔ چنانچہ محسن تاثیر نے "کبابِ ہندی" کو نہ چھوڑا :-

ہمیں بہ سیخِ جگر زلفش ازبلندی شد　　　دلم ز حسرتِ خالش کبابِ ہندی شد

پھر "کھانے" "پینے" کے بعد پان کے لیے تنبولی کے پاس کلیم کو جانا پڑا، لیکن پچھتائے تو کہنے لگے :-

منہ بر وعدۂ تنبولیان دل　　　کہ جز خون خوردن از وے نیست حاصل[۱]

لیکن ظہوری تو تعریف کرتے ہیں :-

چمن از پان گزیدنت رنگیں　　　غنچہ چوں بشگفد گرفتہ اُگال

پھر اور کہتے ہیں :-

شود چہرۂ زرد خورشید آل　　　دہندش اگر نازنیناں اُگال

خانِ آرزو کی آرزو بھی پوری ہوئی ہے :-

پان خوردہ بمن داد اگال آں بتِ ہندی　　　ایں بوسہ بہ پیغام چہ رنگیں مزہ دارد

لیکن اگر اگال کپڑوں پر پڑ جائے اور دھوبی کی ضرورت ہو تو کلیم اس کی صفائی کے متعلق بھی کلام کرتے ہیں :-

ز حُسنِ شستۂ دھوبی چہ گویم　　　ازاں بے پردہ محبوبی چہ گویم[۲]

---

[۱] و [۲] شعر العجم جلد ۳ -

یہاں تک تو عیش وطرب اور کھانے پینے کے لوازمات بتائے گئے، اب معاشرت کے متعلق دوسری چیزیں بھی سُن لیجیے:-

(۲) معاشرت کے لوازمات

رہنے سہنے اور سواری کے لیے انسان بہت سی چیزوں کا محتاج ہوتا ہے

چنانچہ "پلنگ" ایک اوسط درجے کے آدمی کے لیے بڑی ضروری چیز ہے۔ مُلّا سعید اشرف اس کی یاد اس طرح کرتے ہیں:-

پئے خوابِ بہارش فرش کردند | پلنگِ بیدباف از سایۂ بید

پھر اس "پلنگ" کے لیے ملا طغرا مشہدی کو "ساق مُنجہ" کی ضرورت ہوئی:-

شود بہ ہند چو خرّاطِ چرخ بر سرِ کار
ز چوبِ خشکِ تنم ساق مُنجہ می خواہد

پلنگ کے علاوہ "کھاٹ" بھی کارآمد ہوتی ہے، لیکن جب اس کے بھدّے پن کو رندہ کرکے صاف کیا گیا، تو "کت" ایک بلند مرتبہ چیز ہوگئی، چنانچہ فرخی اور مسعود سعد سلمان کی طرح ملا طغرا مشہدی بھی اس کا رتبہ اس طرح ظاہر کرتے ہیں:-

بردرِ بارگاہ چرخ کت است | شاہ را پالکی بدیں صفت است

پالکی کی تعریف کلیم نے بھی کی ہے:-

تا شد ظفر بر آلکی و پالکی سوار | او گیر و او رسہ ہمہ دریک زباں گرفت

ملا طغرا بھی کہتے ہیں:-

چوں کردہ رو بر پالکی گردیدہ خاور پالکی
بنشست تا در پالکی نہ چرخ کہار آمدہ

ـــ۱ سخندان فارس؛ دسواں لکچر۔ (آزاد)۔

جب "کہار" کا ذکر آیا تو "غلام بارہ" کی بھی ضرورت بجا ہے۔ سعید اشرف کہتے ہیں:-

بر در او ز خیل غلاماں بود حصار
زیں رو غلام بارہ تواں گفت خواجہ را [۱]

ملازمت کے سلسلے میں عرفی نے "خواص" لفظ استعمال کیا ہے جو اس معنی میں یقیناً اردو لفظ ہے، اور جو عرفی کے یہاں جگر (جھگر) کے بعد دوسرا اردو لفظ ملتا ہے ان کا شعر ہے:-

مجلست را زہرہ قوال و مگس رانت زحل
آبدارت ابر نیسان و خواصت آفتاب

ملازموں میں ہاتھی کا "مہابت" بھی شامل ہے۔ چنانچہ سلیم کے یہاں یہ لفظ بھی سلامت ہے:-

محبت با خلائق جمع چوں گردد بلا باشد
مہابت پیش پیلے را کہ با زنجیر می آید

ہاتھی اور مہابت کے سلسلے میں ایک بات یاد آئی کہ ہمارے یہاں جو تیز بارش کو "ہتھیا بارش" کہتے ہیں، اس کا ترجمہ کلیم نے "فیل باراں" کیا ہے۔ [۵۲]

شدے فیل از تیر لرزاں چناں
کہ از فیل باراں برہنہ تناں

ہاتھی کے ساتھ ایک گھوڑے کی حقیقت بھی سن لیجیے۔ خواجہ عصمت بخاری ایک

۱؎ بقول آرزو، بارہ در ہندی حلقۂ مردم است۔ (چراغِ ہدایت)

۵۲؎ "پیل راہندوستان یاد دادن" بھی محاورہ ہے جو ہماری وجہ سے اہلِ ایران کی اختراع ہے۔

گھوڑے کی ہجو میں اس کی "نکیل" کا ذکر کرتے ہیں :-

از تارِ عنکبوت ہمی کردمش نکیل　　　کش طاقتِ گسستنِ ایں ریسماں نبود[۱]

ان چیزوں کے علاوہ معاشرت میں اوڑھنا بچھونا بھی آجاتا ہے، پتا یہی چلتا ہے کہ "دولائی" اور "رضائی" بھی ہندوستان ہی میں بنائی گئیں، تاثیر کہتے ہیں :- (دو تہ دالی)

گرفتہ گرنہ رخت گرم باغِ گلشن را

قبائے خود گلِ رعنا چرا دولائی کرد ؟

یہاں دولائی کی بحث اگر لائی گئی ہے، تو ساتھ ہی قبا کا تعلق پنبہ سے سمجھیے کیونکہ خان آرزو، چراغِ ہدایت میں یہ وضاحت کرتے ہیں کہ "در ہندوستان قبا جامۂ پنبہ دار رامی گویند" چنانچہ محسن تاثیر کے یہاں بھی یہی معنی نکلتے تھے۔ اب ملا طغرا کے یہاں بھی دیکھیے، کہتے ہیں :-

شب ہوا سرد است طغرا چوں حباب

بے قبا مغشیں بہ پیراہن مخواب

احمد دین صاحب نے "سرگذشت الفاظ" (ص ۱۶۰) میں رضائی کا تعلق محمد رضا سے بتایا ہے اور میر محمد رائج سیالکوٹی کا یہ شعر پیش کیا ہے :-

از رضا دادیم دل با سرو مہر بہائے یار　　　در زمستاں ہر کسے فکرِ رضائی می کند

---

[۱] بیاض مولانا راشد برہانپوری۔ عصمت بخاری کو طویل بحروں میں کمال حاصل تھا اس نے بایسنغر عضد الدولہ کی مدح میں اٹھائیس اشعار کا ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا مطلع یہ ہے :-

رنگِ رخسار و دُرِ گوش وخط و قد و عارض و خالِ لبت اے سروِ پری روے سمن بر
شفق و کوکب و شام و سحر و طوبیٰ و گلزارِ بہشت ست و ہلال و طرفِ چشمۂ کوثر

(کتاب خانۂ آصفیہ۔ حیدر آباد دکن۔ مخطوطہ ۳۱ صفحہ ۳۳۵ ببعد)

لیکن مولانا عبدالحق صاحب (تنقیداتِ عبدالحق مطبوعہ حیدرآباد، ص ۱۳) لکھتے ہیں کہ اس کا املا "رزائی" ہونا چاہیے، کیونکہ یہ عموماً رنگے ہوئے کپڑے کی بنائی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ خیال بھی صحیح ہو، لیکن بیدل (المتوفی ۱۱۳۳ھ / ۱۷۲۱ء) کے یہاں بھی "رضائی" ہے اور اسی کی رعایت سے مضمون باندھا گیا ہے:-

زتشریفِ حکمت نہ گردیم عریاں
چو بیدل شود پوششِ ما رضائی

"دولائی" اور "رضائی" کو "چھاپنا" بھی ضروری ہے۔ تو اگر ہم نے ایران کو طباعت کے لیے "چاپ کردن" مصدر دیا ہے تو ساتھ ہی امتیاز خاں خالص (م ۱۱۲۲ھ / ۱۷۱۰ء) کو اس "چھاپے" سے خالص شاعرانہ خیال بھی بخشا ہے:-

اگر زوصلِ تو نقشم بکام بنشیند
زبوسہ چھاپہ کنم اطلسِ فرنگ ترا

اسی معاشرت میں روپے پیسے کی بھی ضرورت ہوتی ہے، وحید اس کا ذکر کرتے ہیں:-

کلہ بہر پیسہ دادم کلہ دہ او پاچہ داد
ہر کہ با کم مایہ سودا می کند پا می خورد

یہی پیسہ ملا طغرا کے سرمایۂ کلام میں بھی ہے:-

بگو کیسۂ غنچہ را پیسہ بست
کہ پولِ سیہ بابِ ایں کیسہ بست

روپے پیسے کے معاملہ میں "مہاجن" صاحب کب چوک سکتے ہیں؟ چنانچہ وہ بھی کلیم کے کلام میں موجود ہیں:-

ہمہ سرمایۂ دریا و معدن
فتادہ در دکانِ یک مہاجن

مہاجن کے ساتھ ان کی "ہنڈی" کا تذکرہ بھی آجانا چاہیے، محسن تاثیر کہتے ہیں:-

دو صد نقدِ دل از زلفِ گرہ گیر
ملاحت کردہ ہنڈوی بکشمیر

(۳) ہندوستان کے "جادو" سے متعلق

اپنے یہاں مشہور ہے اور چھتیس گڑھ کمشنری (ممالک متوسط) میں اب بھی یہ قصّے سننے میں آتے ہیں کہ کسی "ڈائن" نے فلاں شخص کو دیکھا اور دیکھتے ہی اس کا کلیجا اپنے قبضے میں کر لیا اور وہ مر گیا، اسی ڈائن کو امتیاز خاں خالص کے والد باقر وزیر قورچی نے "جگر خوار" کہا ہے اور مضمون اس طرح باندھا ہے:-

ہندوے جگر خوار بُوَد چشمِ سیاہش　　　　درزخم دلم ریشہ دوانیدہ نگاہش

اسی قبیل سے چنڈال بھی ایک بلا ہے، حکیم قطران کی طرح ملا طغرا مشہدی نے بھی یہ لفظ باندھا ہے:-

خضر راگم شدہ نعلین و عصا در کشمیر　　　　بہ نگہبانیٔ چنڈال کہ دزدِ چمن است

اِن بلاؤں سے بچنے کے لیے سفلی عمل والے بھی اپنے گرد حصار[1] کھینچ کر ورد کرتے ہیں سلیم اسی مضمون کی طرف اشارہ کرتے ہیں:-

چہ سادگی است کہ خالِ لبِ تو آخر کار
بگردِ خویش چو ہندو خطِ حصار کشید

مسلمان بھی اسی جادو کے دفعیہ کے لیے قرآن پاک کی سورۂ فلق اور ناس یا کوئی اور آیتیں پڑھتے ہیں، اسی کی طرف مسیح کاشی کا اشارہ ہے:-

جادوے زلفِ تو با مصحفِ رویم خانہ است
ایں چہ جادو است کہ قرآن نتواند زدنش

---

[1] حصار کھینچنے کا تصور تلسی داس کی رامائن (ارائن کانڈ) میں بھی ملتا ہے کہ لچھمن نے سیتا کی خاطر ایسا حصار کھینچا تھا:- "چھوں دِشی دیکھ کھنچائی اہی شا"

(۴) اردو کے محاورات

اب اردو کے کچھ ایسے محاورے، روزمرّے[1] اور کہاوتیں بھی دیکھ لیجیے جو فارسی والوں کے یہاں مستعمل ہیں۔ فاضل علمی پروفیسر حافظ محمود شیرانی مرحوم نے اورینٹل کالج میگزین (بابت نومبر ۱۹۲۹ء) میں ان کو جمع کیا ہے۔ ان میں سے کچھ یہاں بھی پیش کیے جاتے ہیں:-

(۱) نہال گردیدن = نہال ہونا۔ (مفرح القلوب)

(۲) درخزانہا جاروب دہانید = خزانوں میں جھاڑو دلوادی (برنی ص ۱۸۱)۔

(۳) ماتم داری کے ایام میں زمین پر سوتے تھے "زمین خفتن" محاورہ خسرو کے یہاں ہے:- ع

ور زمیں خفتن ہمہ آفاق شد پہلو کبود

(۴) گفتار گفتن = بات کہنا۔ خسرو نے کہا ہے:-

من از سر زندہ گردم گر تو یارا یک سخن گوئی
تو می دانم بگوئی لیک من گفتار می گویم

(۵) مالاکلام کردن = سودا یا معاملہ طے کرنا۔ خسرو کا شعر ہے:-

دعوائے خوں بہائے دلِ خویش می کنم — یک بوسہ بالبم زن و مالاکلام کن

[1] روزمرّہ وہ اسلوب اور بول چال ہے جو اہلِ زبان کے یہاں رائج ہو۔ خواہ وہ قواعد کے مطابق بھی نہ ہو۔ لیکن محاورہ ہمیشہ قواعد کے مطابق ہوتا ہے اور کم از کم دو کلموں سے مرکب ہوتا ہے۔ وہ اصلی معنوں کے بجائے بطور تمثیل کے بولا جاتا ہے یعنی استعارہ نہیں ہوتا۔ مثلاً تین پانچ کرنا۔ دل آنا۔ وغیرہ۔ محاورہ کلام کا جزو بن جاتا ہے لیکن کہاوت الگ ہی رہتی ہے اور کسی مسلّمہ تمثیل یا تلمیح پر اس کی بنیاد ہوتی ہے جیسے دھوبی کا کتا، گھر کا نہ گھاٹ کا۔

(۶) ازگرہ رفتن۔ گرہ سے چلا جانا۔ خسروؔ نے لکھا ہے:-

جان می رود ز من چو گرہ می زند بہ زلف
مردن مراست ازگرہِ او چہ می رود [1]

(۷) نیشکر با پیل خوردن۔ خسروؔ کے یہاں ہے:-

نشاید نیشکر با پیل خوردن | نہ در رنگ با صبا تعجیل کردن (خضر خانی) ص ۳۰۰

(۸) اس کے پیٹ میں دانت ہیں۔ خسروؔ کے کئی اشعار ہیں:-

ے حسود را کہ ازو بود در شکم دنداں | ہمہ ز خونِ جگر رنگ چوں انار گرفت

ے چوں تیر بداں راست دلش را زیر اک
چوں خربزہ دندانش درونِ شکم است

ے چہ بینی چرخ را زاں گونہ خنداں | نگہ کن در شکم چنداں است دنداں

(۹) سب کو ایک لاٹھی سے ہانکنا۔ خسروؔ کی ایک رباعی ہے:-

خسروؔ ز زبانِ تست گوہر ہمہ را | پیدا ز نہانِ تست جوہر ہمہ را
شد راندہ سنان و تیغ و تیر از کلکت | زیں گونہ بیک چوب مراں ہر ہمہ را

(۱۰) اِن تلوں میں تیل نہیں۔ یہ بھی خسروؔ کے یہاں ہے:-

خالے بہ رخش دیدم و گفتم کہ تل است
گفتا کہ برو نیست دریں تل تیلے

---

[1] بہارِ عجم میں اسے فارسی ہی کہا گیا ہے اور صائبؔ کا شعر پیش کیا ہے:-

خون می چکد ز غنچۂ منقار بلبلاں | زیں نقدِ تازہ کز گرہِ روزگار رفت

غالبؔ نے بھی کہا ہے:-

گوئی مباد در شکنِ طرہ خوں شود | دل زانِ تست ازگرہ ما چہ می رود

لیکن صائبؔ اور غالبؔ دونوں ہمارے ملک سے متاثر ہیں۔

(۱۱) عربی میں غصّہ کے معنی "گلوگرفتگی" اور فارسی میں "غم" کے ہوتے ہیں لیکن اردو میں "غیظ" کے ہیں۔ اردو کے یہی معنی فارسی میں بھی آگئے ہیں۔ مثلاً خسرو لکھتے ہیں:-

شد اندر غصہ شادی خانِ والا
مدد جُست از پناہِ حق تعالیٰ (خضر خانی ص۲۷۶)

ضیاء برنی نے بھی لکھا ہے:-

"واگر غصہ خواہی کرد" (ص۳۳۵)

"دریں ایام غصّۂ سلطان محمد بر خلق بیشتر بود" (ص۵۱۳)

ظہوری بھی لکھتے ہیں: ع

فرو می خورم غصّۂ سینہ در

(۱۲) چراغ لے کر ڈھونڈنا۔ برنی نے لکھا ہے:-

"مغل را چراغ برکردہ طلب کردے" (ص۳۲۳)

"ایں روز چراغ برکردہ می طلبیدند" (ص۱۷۰)

(۱۳) بیڑا اٹھانا۔ ضیاء برنی لکھتے ہیں:-

"راوتان و پایکانِ معروف ازیلک چھجو، بیڑۂ تنبول گرفتہ بودند و دعویٰ کردہ" (ص۱۸۳)

"و بیڑۂ جان بازی از پیشِ الیاس بھنگی می گرفتند" (ص۵۹۳)

خسرو نے بھی خزائن الفتوح (ص۱۶۰) میں لکھا ہے:-

"بسخنانِ رنگیں فراپیش دادند کہ راوتان را بیڑۂ تنبول باید داد تا جان سپاری کنند"

(۱۴) اندر اندر گھٹنا۔ (برنی ص۲۰۴) لکھتے ہیں:۔

"و درون درون می کاہیدند"

(۱۵) خالہ کا گھر۔ (ص۱۴۴) برنی نے لکھا ہے:۔

"چناں کہ خوردگانِ نازنین درخانۂ خالگاں مہمان روند"

(۱۶) "اللہ آمین" کرنا۔ برنی (ص۵۳۵) نے لکھا ہے:۔

"و آن کہ شل زنند آمین اللہ آمین اللہ کنان درمنزلِ اول رسیدند"

(۱۷) چکر آنا۔ برنی (ص۵۰۴) کے یہاں ہے:۔

"و فلک را از نظارۂ چناں نثارے دوران می آمد۔"

ان کے علاوہ شمس سراجِ عفیف کے یہاں بھی بہت سے روزمرّے اور محاورات ہیں۔ مثلاً:۔

(۱۸) اپنی گرہ سے خرچ کرنا۔ "خرج و اخراجات از گرہِ خویش می کردند۔" (ص۵۹)

(۱۹) چپکے چپکے۔ "خواجہ جہاں پنہاں پنہاں در خاطر خویش۔" (ص۶۷)

(۲۰) بارہ باٹ ہونا۔ کچھ فرق کے ساتھ ہے: "خلائق دہلی ہفت رہ شد۔" (ص۱۸۵)

(۲۱) ناک میں دم آنا۔ "جانِ ایشاں بہ بینی رسیدہ۔" (ص۲۲۶) [1]

(۲۲) ذرّہ بھر۔ "ذرۂ میل ندارد۔" (ص۳۱۲)

(۲۳) کسی کی ہائے لینا۔ "آہِ دلِ او کہ استاند۔" (ص۵۱۲)

(۲۴) سختی پہ سختی کرنا۔ "تفتی بر تفتی کردے۔" (ص۳۹۷)

---

[1] خسرو نے بھی کہا ہے:۔

تا تو از چشم لطف در بینی — جانِ مردم رسید در بینی

(۲۵) پگڑی اتار لینا۔ (بے عزتی کرنا) "چوں پگ از سر فرود آورد ندچہ حرمت ماند"۔(۳۴)
نویں صدی ہجری کی لکھی ہوئی مفرح القلوب میں سے بھی شیرانی مرحوم نے
روزمرے محاورے اور کہاوتیں تلاش کی ہیں۔ کچھ یہ ہیں:۔

(۲۶) کانوں پہ ہاتھ دھرنا۔ "ہر دو دستِ خویش بر گوش نہاد"۔

(۲۷) جان ہے تو جہان ہے "اول جان بعدہٗ جہان"۔

(۲۸) آدھی چھوڑ پوری کو بھاگے "نیم نان گذاشتہ برائے تمام نان برود"۔

(۲۹) چور کی ماں کوٹھی میں سر دے کر روئے "مادرِ دزد سر در کند و انداختہ گریہ می کند"۔

(۳۰) تسموں سے کھال اُدھیڑنا "پوستِ شما از دوال خواہم کشید"۔

(۳۱) افیون اتر جانا "افیون فرود آمد"۔

(۳۲) مجھ سے کوئی کیا لے گا "از من چہ خواہد گرفت"۔

(۳۳) اگر اپنی خیریت چاہتے ہو "اگر خیریتِ خود می خواہی"۔

(۳۴) یہ کیا تھوڑی مہربانی ہے کہ میری جان چھوڑ دی؟ "ایں اندک لطف کہ جانِ مرا گذاشتہ؟"

(۳۵) میرا نصیبہ کھل گیا "ایں بختِ من کشادہ"۔

(۳۶) ع جوڑے سے وہ جڑے نہیں اور بیچ گرہ پڑ جائے "اگر رسن شکستہ شود کسے پیوند کند گرہ از میان نہ رود"۔

ان مصنفین کے علاوہ ہم کو دوسرے شعراء کے یہاں بھی ایسی مثالیں ملی ہیں۔
ان میں سے کچھ یہاں پیش کی جاتی ہیں:۔

(۳۷) "چراغ تلے اندھیرا" صائب لکھتے ہیں :-

تیرہ بختی لازم طبعِ بلند افتادہ است
پائے خود را چوں تواند داشتن روشن، چراغ

(۳۸) اردو کا ایک محاورہ ہے "شرم کے مارے پانی پانی ہو جانا" یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ترجمہ "آب شدن" ضرور اردو کا فیض ہے ۔ صائب کہتے ہیں :-

ہلالِ غبغب جاناں لطافتے دارد
کہ از اشارۂ انگشت آب می گردد

یا محسن تاثیر کا شعر ہے :-

شکّر کہ برد دل ز جہانے بہ حلاوت
آب ار نہ شود پیش لبت از سر خامی است

(۳۹) "آب آوردن" یعنی کسی چیز کو مفت حاصل کرنا ۔ بقول صاحب مصطلحات الشعرا یہ محاورہ ہماری زبان سے فارسی میں لیا گیا ہے ۔ مخلص کاشی کا شعر ہے :-

چوں دریں بحرِ پُر آشوب نظر باز کنم
چشم من آب نیاوردہ بماند چو حباب

(۴۰) کم از کم ہندوستان میں یہ ضرور ہے کہ جب رنگریزوں کے نیل کے مٹکوں میں اُبال آجاتا ہے جسے "ماٹ بگڑنا" کہتے ہیں تو وہ لوگ کوئی بات بے پر کی اُڑاتے ہیں، اور اُس سے یہ فائدہ تصور کرتے ہیں کہ وہ اُبال بیٹھ جاتا ہے اسی خیال کو مدنظر رکھ کر میرزا نظام کہتے ہیں :-

حرفِ وصل من وا و می گویند
بہ زیان رفتہ خمِ نیلِ فلکؔ[1]

(۴۱) "چشم پریدن" ضرور فارسی میں ہے۔ جیسے صائب نے لکھا ہے:۔

چنیں کہ می پرد از حرص خاکیاں را چشم
عجب اگر پر کاہے بکہکشاں ماند

لیکن ہمارے یہاں آنکھ پھڑکنا ایک اعتقاد ہے کہ کوئی شخص اگر ہم کو یاد کرتا ہے تو ہماری آنکھ پھڑکتی ہے۔ علی قلی خاں نے اسی خیال کو باندھا ہے:۔

می پرد چشمِ منم پیکے از ایراں می رسد
نامۂ شاید بمن از پیشِ سلطاں می رسد[2]

(۴۲) جک زدن "جھک مارنا" بھی اردو کا محاورہ ہے، میر جلال الدین غالب کا شعر ہے:۔

بر گفتۂ واعظ نتواں ترکِ طرب کرد
توبہ کند آں مرد کہ کو جک زدہ باشد[3]

(۴۳) مگس پرانیدن "مکھی اڑانا" یا "مکھی مارنا" اردو کا محاورہ ہے۔ ظہوری نے[ف] باندھا ہے:۔

مصریاں چوں نہ پرانند مگس با دلِ تنگ
زہر نوشانِ تو گر کام بہ شکر نہ دہند

ف۔ شفائی نے بھی کیا خوب کہا ہے:۔ رواجِ جاہ فزوں تر ز من زبادہ کند - مگس براندن مارا بزور دکان شکن

---

[1] بہارِ عجم۔ اردو میں یوں آیا ہے:۔
چرچا بہت دروغ کا ہے زیرِ آسماں شاید کہ ماٹ نیل کا کوئی بگڑ گیا (اسیر)

[2] منتخب النفائس ص۔ [3] ایضاً ص۶

(۴۴) "دست زیرِ شال بُردن"۔ بقولِ آرزو (چراغِ ہدایت) تشخیص و قرار دادن قیمت مطلقاً در ہندوستان ایں رسم مخصوص دلّالانِ اسپ است۔

سعید اشرف کا شعر ہے:-

بہرِ در سود ابود دلّالِ او　　　می برد دستے بزیرِ شالِ او

(۴۵) "صدا بیک دست برنہ آمدن"۔ ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجتی۔ میرا خیال ہے کہ غنی کشمیری نے اردو سے یہ محاورہ لیا ہے:-

برد ہمیشہ دل از کفِ صدائے موسیقار
صدا نگو کہ بیکِ دست بر نمی آید

ان کے علاوہ خیال ہوتا ہے کہ حسبِ ذیل محاورات بھی ہماری زبان سے فارسی میں آئے ہوں گے:-

(۴۶) "دست در دندان ماندن" (دانت میں انگلی دینا)۔ خسرو کہتے ہیں[1]:-

خفتہ برخاست از زمیں خنداں
ماند بنیدہ دست در دنداں

(۴۷) "آب در چشم (دیدہ) نداشتن" (آنکھوں کا پانی ڈھل جانا۔ شرم و حیا نہ ہونا) صائب کہتے ہیں:-

تمام رحمت و لطف است عشقِ بندہ نواز
چہ شد کہ آبِ مروّت بچشمِ اخواں نیست[2]

(۴۸) "آب بدہان آمدن"۔ (منہ میں پانی بھر آنا)۔ اشرف کا شعر ہے:-

از خرامیدنِ شیرینِ تو یاد تخیاں　　　دیدہ را آب ز حسرت بدہاں می گردد

فغانی کے یہاں بھی ہے:-

چناں پیالہ دُردی کشاں بلالب شد　　　کہ خاک را ز ہوس آب در دہان گردید

[1] ممکن ہے کہ فارسی میں بھی مشترک ہو۔ سعدی کہتے ہیں:- انگشت تعجب جہانی - از گفت و شنید با بدندان
[2] والہ ہروی نے کہا ہے:- بگشت سخن دہ از دو لبان وفا مجو گر درد دل را - بر بنائے آب ست چشم مجو چون چشم عریانش

(۴۹) "باغِ سبز نمودن" بھی غالباً ہمارے ملک کی اختراع ہے۔ محسن تاثیر کا شعر ہے:-

عنبریں خطّے بدامِ وعدۂ خامم کشید
باغِ سبزی ہر طرف بنمود در دامم کشید

(۵۰) "بیک چشم دیدن" (برابر سمجھنا) بھی غالباً ہمارا محاورہ ہے اور فرہنگ آنندراج میں بھی آیا ہے۔ ان کے علاوہ ہمارے متعدد الفاظ و محاورات کی رعایت اعجازِ خسروی میں آئی ہے۔

۵۱۔ متفرقات

اس متفرقات کی فہرست میں ہماری زبان کے چند بکھرے ہوئے الفاظ اور رسن دیکھیے جو فارسی شعرا استعمال کرنے پر مجبور ہوئے۔ ہندوستان کے مشہور تیوہار دیوالی (دوالی) کے چراغاں کی روشنی دیکھیے:-

وحدت گیلانی:-

زلفت ز نقد دلہا اندا خت گنج وافروخت
از عارضت چراغے چوں ہندوی دوالی

اور محسن تاثیر بھی کہتے ہیں:-

از بادہ چراغ کرد روشن   چشم تو بہندوی دوالی

ایک لفظ جوڑہ مسیح کاشی کے یہاں ہے۔ (رباعی)

شہبازِ فلک جوڑۂ این کرگس نیست
چوں خرقۂ شالم فلکِ اطلس نیست
در دہر کسے ہمسر این ناکس نیست
از پیش نہ رفتہ ہست و اندر پس نیست

"چوکھنڈی" کی شان سعید اشرف اس طرح بتاتے ہیں:۔

چوکھنڈیِ شکوہش اگر سایہ افگند
فیلِ سپہر شانہ بدزدد بزیرِ پا،

"چیرہ" بقولِ آرزو ہندوستان کی پگڑی ہے، سلیم کہتے ہیں:۔

زعکسِ ماہ وموجِ آب در شبہا بجوش آیم
کہ پندارم بتِ من چیرۂ زرتار می بندد

نعمت خاں عالی کے یہاں متعدد الفاظ ہیں، مثلاً چیلہ:۔

مشغول بہ چوبدار و فراشش
مشغوف بہ بارگیر و چیلہ

انھوں نے بجا (بجانا) کی رعایت یوں کی ہے:۔

حرفِ بجا ز کس نشنیدم ز اہلِ ہند
غیر از کسے کہ گفت بمطرب بجا بجا

ایک لفظ "سگھڑ" بمعنی زیرک بھی ان کے یہاں ہے:۔

اے خدا عالی بیچارہ بہند آمدہ است
نازنین شوخ، ظریفے، سگھڑے می خواہد

سخندانِ فارس کے دسویں لکچر میں مولانا آزاد نے اس لفظ کو مقام "سکھر" سے منسوب کیا ہے لیکن فرہنگ آنند راج جلد دوم صفحہ ۳۸۴........ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ "سگھڑ" بروزن "ہنر" بمعنی "زیرک" ہی صحیح ہے۔

"نگر مچھ" سعید اشرف کے شعر میں ہے :-

گردن شکستہ کہ بہ نسبت وزیر اوست
از پاے تا بہ سر چو نگر پیچ ہمہ گلو است[۱]

"تنباکو" جو عہد اکبری میں ہندوستان آیا۔ اس کی تعریف نظیری نے خوب کی ہے (شعر العجم جلد ۳)۔ لیکن اس کے پینے کے لیے "حقہ" بھی یہیں بنایا گیا، میر امامی :-

حقہ ریزد عطر از گلہائے زنگار رنگ او
خوشتر است از عجب ایجاں دود تنباکو مرا

گل کا ذکر آیا تو ہندوستان کو نہ بھولنا چاہیے، کیونکہ یہیں "گل" کو "گلاب" بھی کہا گیا اور ملا طغرا بھی ہندوستانی گلاب کی خوشبو کا لطف اٹھانے لگے :-

زخوے آلِ نبیؐ چوں گل گلاب شدہ است
شقایق از حسدِ بختِ گل کباب شدہ است

ہندی معشوق کی پیشانی کا ٹیکہ بھی ایک "گل" ہی ہے جو ملا طغرا کو پسند آیا۔

گلِ ٹیکہ بر طاقِ ابروے او
بود خار رنگین ترازوے او

ظہوری نے "جگت گروئی" کی داد دی۔ کہتے ہیں :- "بارِ جگت گروئی یعنی استادی عالم بر گردن گرفتن و زحمتِ تربیتِ شاگرداں کشیدن غرضِ التفات و مرحمت است۔ ۔ ۔" (نثر دوم۔ صفت نہم)۔

---

[۱] سرخوش نے کلمات الشعراء (لاہور ۱۹۴۲ء) میں جہانگیر کا ایک مصرع لکھا ہے :-
ع چیتہ پادشاہ زد کالہ

پھر بعض الفاظ یہیں بیٹھ کر بنائے گئے۔ مثلاً یہاں کی ایک گھاس کو بقول علامہ سید سلیمان صاحب ندوی (نقوشِ سلیمانی ص ۲۹) "خس" کہا اور خس خانہ بھی بنایا، چنانچہ فصیحی ہروی کہتے ہیں:-

آسماں ماتمِ خس خانۂ خود گیر کہ سوخت
آتشِ نالۂ ما دشت شکیبائی را[1]

"کارِ خیر" بھی یہیں انجام پایا جو بقول صاحب غیاث اللغات بیٹی کے نکاح کے لیے مستعمل ہے۔ اس لیے "رشتے" کی رعایت بھی دیکھیے جو سلیم کے یہاں ہے:-

کمرش را سلیم تنگ بگیر
با خبر باش رشتہ باریک است

زمیندار بھی غالباً یہیں بن بیٹھے، محسن تاثیر کہتے ہیں:-

در جہاں آباد گلزارش ہزارے بلبل است
از زمینداران ہند و طرۂ او سنبل است

ہندی میں ایک لفظ "جات" بمعنی قوم و نسل ہے، اردو میں ہم نے اسے "ذات" بنالیا، اور یہی لفظ فارسی میں بھی آگیا۔ متقدمین میں سید حسن غزنوی (المتوفی ۵۵۶ھ) کے یہاں ہے:-

بخلق و خلق زشت و بدبخورد و زیست دام و در
بہ اصل و ذات دون و دد بہ قول و فعل شور و شر

اگر اس شعر میں "ذات" کے یہ معنی نہ بھی لیے جائیں تو کم از کم ملا طغرا کے یہاں ضرور یہی معنی نکلتے ہیں:-

---

[1] میرزا قبول نے بھی کہا ہے:-
روئے آسایش ز اشکِ گرم نابیند دمے ـ ساخت چشم بے رخت خس خانہ از مژگانِ خویش

گر گشاید از قدح نوشے بطِ مے را دہن

ذاتِ مرغابی است خواہد صاحبِ منقار شد

ایک جگہ اور لکھتے ہیں :-

شوخ سوسن رانگو دل می رباید فشقہ ات

ذاتِ رجپوت است ترسم دست بر جمدھر کند

یہاں ذات کے ساتھ "جمدھر" ایک دوسرا لفظ آگیا، یہ بھی یہیں کا لفظ ہے اور خنجر کے معنی میں آتا ہے، جیسا کہ ولی کے یہاں بھی ہے :-

صفِ مژگانِ خوباں مل کے یکسر

اٹھے ہیں عاشقاں پر کھینچ جمدھر[۵۱]

تاریخ فرشتہ (ص ۳۰) میں بھی جمدھر ہے : "برخے دروازۂ قلعہ را کشودہ دست بخنجر و جمدھر کردہ با مسلماناں چنداں جنگ کردند کہ بالتمام بقتل رسیدند۔"

ہاں تو "ذات" کے متعلق بحث تھی جسے ہم ذال سے لکھتے ہیں، لیکن چونکہ یہ ہندوستان ہی کی پیداوار ہے، اس لیے محترم ڈاکٹر عبدالستار صاحب صدیقی زور دیتے ہیں کہ اسے "ذال" کے بجائے "زے" سے لکھنا چاہیے[۵۲]۔

ان بدعاتِ حسنہ میں ظہوری کی کوششیں بھی فراموش نہ کرنا چاہیے۔ لفظ "خراط" جو "ط" سے تھا غالباً ظہوری نے سب سے پہلے دال سے لکھا اور اب خراد ہمارے یہاں دال ہی سے لکھا جاتا ہے، ظہوری کی یہ بدعت اس طرح ہے :-

فرز راز استقامتش خراد[۵۳] زندہ کردہ ست کجروی زہاد

---

[۵۱] کلیات ولی۔ ص ۳۳۵ — [۵۲] رسالہ ہندوستانی۔ جنوری ۱۹۳۱ء ص ۱۹۔ — [۵۳] نثر سوم

ایک اور لفظ "مکتب خانہ" ظہوری نے غالباً سب سے پہلے لکھا، ان کی نثرِ دوم (صفت نہم) میں ہے:-
"ارباب استعداد را صحبت کتاب خانہ کہ مکانِ فیضِ الٰہی است و مکتب خانۂ[1] اوستادانِ معنی اعنی شاگردانِ اعلیٰ حضرت ظلِ الٰہی روزی باد۔"

ظہوری کے ایک شعر میں بھی یہی "مکتب خانہ" آتا ہے:-

کنم در عشق مکتب خانہ خود کوہ و ہاموں را
بیاموزم طریقِ عاشقی فرہاد و مجنوں را

صائب نے بھی لکھا ہے:-

تا مبادا آگاہ از ذوقِ گرفتاری شوند
می کنم آزاد طفلاں را ز مکتب خانہ ہا

اسی لیے جب "مکتب خانہ" صحیح ہے تو شاید ان دو شاعروں کا "محشرستان" بھی صحیح ہوگا۔

بہرحال اس صدی سے ملک کے ہر گوشے کے فارسی کے شعراء کے یہاں بکثرت اردو الفاظ استعمال ہونے لگے۔ سندھ میں اسی صدی کے ضیاء الدین ضیاء اردو کے باکمال شاعر تھے۔ ان کے علاوہ حیدر الدین کامل اور قانع تتوی کا اردو کلام مقالات الشعراء (کراچی ۱۹۵۷ء ص ۶۷۳-۶۷۵) میں ملتا ہے۔ عبدالحکیم عطا تتوی (مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی)

---

[1] پروفیسر عبدالغنی صاحب نے اپنی کتاب "ادبِ دورِ مغلیہ" کی تیسری جلد ص ۳۵۰ میں اس جگہ "مکتب خانہ" کے بجائے غالباً اصلاح کر کے "کتب خانہ" کر دیا ہے۔ لیکن ص ۳۸۴ پر انھوں نے اس کا ترجمہ "اسکول" ہی کیا ہے۔

(م ۱۱۲۹ء) کے دیوان فارسی میں بہت سے اردو الفاظ ہیں۔ بلکہ کچھ اشعار ایسے بھی ہیں جنھیں ریختہ کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً

مسافر را ہمیں آب و غذا خوش — کہ از اشک و آہ دوشا دوش رہتا

چو گل رنگِ حنا بندی بریزد — چو نیلوفر کہ نیلی پوش رہتا

بہر دم آدمی بے چارہ بے تاب — بغمہا غوطہ نوشا نوش رہتا

پھر فارسی میں اردو الفاظ کا برجستہ استعمال اور بھی بڑھتا گیا۔ سندھ کے نامور شاعر عظیم تتوری (م ۱۲۲۹ء) کے یہاں درس (درشن) کا لفظ یوں آتا ہے:۔

باچنیں رخ بابِ درسِ مطلع الانوار نیست
باچنیں دل کارِ من با مخزن الاسرار نیست
(دیوان قلمی)

بعد میں غلام محمد خان ابن علی محمد خاں لغاری (م ۱۲۷۹ء) کے فارسی دیوان میں بھی ایسے الفاظ آجاتے ہیں۔ مثلاً لوٹ مستعمل ہے:۔

بُرد یکبار گی دل و دینم
لوٹِ ترکانہ کردہ است مرا
(دیوان قلمی)

خلاصہ یہ کہ ہماری زبان میں مسلمانوں کی آمد کی وجہ سے ترکی، عربی اور فارسی کے الفاظ بکثرت رائج ہوئے۔ لیکن چونکہ ترکی کی جگہ فارسی خود ہمایوں کے زمانے میں داخلِ دربار ہو گئی تھی اس لیے ترکی کے الفاظ میں تغیر کم ہوا اور عموماً وہ اپنے اصلی معنی میں قائم رہے۔ البتہ ان کا تلفظ بدل گیا۔ مثلاً توشک، تُوزک، کوشک، کورنش، یورش، تیمور، نوکر، آتالیق وغیرہ۔ اس کے برعکس فارسی کو سیاسی اور عربی کو مذہبی حیثیت

---

۵ دیوانِ عطا۔ ص ۴۵۹۔ سندھی ادبی بورڈ۔

حاصل رہی ہے اس لیے ان زبانوں کے الفاظ بکثرت استعمال ہوتے رہے اور ہماری ضرورت کے مطابق ان کے تلفظ، املا اور معنی میں بھی تبدیلی ہوتی رہی۔ تبدیلی، واقعی، طغیانی، انکساری، غلطی، خلاصی، قدیمی، دائمی، دوامی، سلامتی، واجبی، وغیرہ کتنے عربی الفاظ ہیں جن میں ہم نے ی کا اضافہ کیا ہے۔ لیکن محاذی میں سے ی اڑادی ہے۔ محاباۃ، محابا رہ گیا اور مداراۃ، مدارا (فارسی میں بھی) رہا۔ شکوٰی کو شکوہ اور بلوٰی (آزمائش، محنت) کو بلوا کر دیا۔ یال سے ایال[۱]، ہبنّق (عرب کا ایک احمق) سے ہونق، خرافہ (قبیلۂ عذرہ کا ایک دروغ گو) سے خرافات اور قفص سے (فارسی میں بھی) قفس بنایا گیا۔ علّامہ، قطّامہ، حرّافہ کے اردو معنی اور ہیں۔ اسامی (اسم کی جمع)، اراضی (ارض کی جمع)، اجنہ (جنین کی جمع لیکن اب جِن کی جمع)، عادی (معتاد کی جگہ)، مدلّل (مستدل کے بجائے) طلباء (طلبہ کی جگہ) ہماری زبان کے الفاظ ہیں۔ غلام (لڑکا)، محنت (غم و تکلیف)، مکان (ہونے کی جگہ)، مبلغ (کسی حد تک پہنچا ہوا)، غریب (مسافر) حجامت (پچھنے لگوانا)، شکیل (ہم مثل)، اصیل (اب ماما کے معنی ہیں) وغیرہ کے اصلی معنی[۳] کی طرف اب کس کی نظر ہے؟۔ تردد (آمد و رفت)، تکلف (برخود رنج

---

[۱] خود قرآن پاک میں رسم الخط کی ایسی تبدیلی نظر آتی ہے۔ ربٰو سورۂ روم میں ربا ہے۔ حیٰوۃ کی جگہ (۲۲/۹، ۳۰/۱۴) صرف حیات ہے۔ ریاء (ریا)، زنیٰ (زنا) بھی بعد میں تبدیلی کے ساتھ لکھے گئے۔ اسی طرح شروع کی سورتوں میں ابراہم ہے اور بعد میں ابراہیم ہے۔

[۲] الماس بغیر الف لام کے کوئی نہیں بولتا۔

[۳] مولانا سلیمان ندوی مرحوم نے نقوشِ سلیمانی (تمہید) میں اور رشید حسن خاں صاحب نے اردو ادب (علی گڑھ۔ مارچ ۱۹۵۷ء) میں ایسے الفاظ پر بحث کی ہے۔

نہادن)، تغیّر (باب تفعّل میں بمعنی بدل جانا اور باب تفعیل میں بمعنی بدل دینا)، ترسیل اور تنقید (جو باب تفعیل میں نہیں)، تقریر (ثابت کرنا)، تردید (لوٹا دینا) اور تعطیل (بے کار کرنا، خالی چھوڑنا) وغیرہ اپنے معنی میں کس قدر بدل گئے ہیں! تعطیل کا استعمال صائب کے یہاں یوں ہے:-

روزِ تعطیل بغربان کدۂ مشرب نیست

صبحِ شنبہ خجل ست از شبِ آدینۂ ما

فارسی الفاظ کے معنی میں جو تبدیلی کی گئی ہے اس کی مثالیں آچکی ہیں۔ لیکن سیکڑوں الفاظ ایسے ہیں جو ہم نے اپنے ملک کی فارسی میں رائج کیے اور وہ اردو کے لیے سرمایۂ افتخار بنے۔ سرپرست (اصل فارسی میں خادم) تپاک (بے قراری، اب گرمجوشی) خالو (پہلے ماموں کے معنی میں تھا)، تنخواہ، رہاکش، نمائش، شادی (نکاح) تاریخ دار، طرح دار، تیمارداری (تیمار کافی تھا)، عیال داری، درباداری، تاہم، خاوند (خداوند سے بنایا گیا)، خانگی (بدعورت)، داشتہ، آوارہ وغیرہ عام لغات ہیں۔ لیکن کسی ایک شعبے سے متعلق (مثلاً درباداری کے) الفاظ دیکھیے تو بھی ان کی کمی نہیں:- ہرکارہ، کارندہ، گماشتہ، متصدی، نائک، پیش کار، چوبدار، رکابدار، جمعدار، باندار (دیہات کا محافظ)، پورہ دار، رسالدار، سررشتہ دار، زمیندار، صوبہ دار، اسم نویس، صاف نویس، خوش نویس، خفیہ نویس، سیاہہ نویس، اخبار نویس، وقائع نگار، سوانح نگار، داروغہ، دعاگو، عرض بیگی، میر عدل، میر منزل، میر آتش، میر مطبخ، دیوان خانہ، دیوانِ عام، دیوانِ خاص، جلوت گاہ، پیش گاہ،

لہ اس قبیل کے بکثرت الفاظ ہماری زبان میں ہیں۔ تیمار سے بو تیمار (بگلا) بھی قابلِ لحاظ ہے۔

پروانگی، جواہر پوشی، دیوار گیری، جائداد، جاگیر، علاقہ، خالصہ، پرگنہ، صوبہ، سرکار جیسے کس قدر الفاظ ہیں جو یہیں پیدا ہوئے اور یہاں کی فارسی میں رائج ہوئے۔ پھر ان کی عام مقبولیت کے سامنے اصل فارسی کا رنگ بھی پھیکا پڑ گیا۔ چنانچہ اٹھارہویں صدی عیسوی (یعنی بارہویں صدی ہجری) کے شروع ہوتے ہی ولی کی ولایت اور بادشاہت نے فارسی کی بچی کھچی پونجی کو بھی مالِ غنیمت سمجھ کر چھین لیا، انوری نے سچ کہا تھا:-

تا عشقِ تو در سینہ مکان کرد کرا جا؟
کس دید در آفاق بیک شہر دو راجا؟

اشاریہ

الف

م

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کی مطبوعات

(۱) **فارسی پر اردو کا اثر**:- جو ناظرین کے زیرِ نظر ہے۔ قیمت مجلد دو روپے (عہ)

(۲) **سید حسن غزنوی**:- یہ نہایت فاضلانہ علمی مقالہ ہے جو ایک ایرانی پروفیسر تقی مدرس رضوی کے اس موضوع کے مقالے سے پہلے شائع ہوا ہے اور اس سے زیادہ اہم اور وقیع ہے۔ قیمت سات روپے (معہ)

(۳) **تاریخ بہرام شاہ غزنوی**۔ یہ تحقیقی مقالہ انگریزی میں ہے اور سلطان بہرام شاہ غزنوی کی ۴۱ سالہ حکومت کا جائزہ ہے۔ اس مقالے کی تیاری میں مشرق و مغرب کی تمام متعلقہ مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ علامہ پرنسپل محمد شفیع صاحب کا پیش لفظ بھی ہے۔ قیمت مجلد چار روپے (للعہ)

(۴) **حالی کا ذہنی ارتقاء**: یہ ایک تحقیقی اور علمی مقالہ ہے جس میں ان تمام کیفیات و حالات کا جائزہ ہے جو حالی کی مختلف تصانیف پر وقتاً فوقتاً اثر انداز ہوئے ہیں۔ حالی پر ایسی جامع اور تحقیقی کتاب آج تک شائع نہیں ہوئی۔ قیمت مجلد ۵ غیر مجلد للعہ

(۵) **علمی نقوش**:- مولانا عبد الماجد دریابادی (صدق جدید ۱۱ اکتوبر ۵۷ء) فرماتے ہیں کہ "مجموعہ ۱۶ مختلف علمی، ادبی، تنقیدی، تحقیقی مضامین کا ہے۔ موضوع قدیم و جدید ہر قسم کے ہیں، مگر قدیم زیادہ، جدید کم ... مصنف ڈاکٹر ہیں اور ایک یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر۔ لیکن نہ تجدد زدہ ہیں نہ ترقی پسند۔ اس لیے اردو سیدھی سادی، صحیح، سلیس و شستہ لکھتے ہیں۔ جیسی ہر اس شخص کو لکھنا چاہیے جس کی مادری زبان اردو ہے۔ جناتی زبان نہیں لکھتے۔ ان کا ذوق سلیم ہے اور علامہ سید سلیمان ندوی اور نواب صدر یار جنگ شروانی کے مکتبِ تربیت کے فیض یافتہ ہیں۔ تنقیدی مضامین میں تبصرے عموماً سلجھے ہوئے، شایستہ و متوازن ہیں۔ تحقیقی مضامین میں اندازِ بحث سنجیدہ اور مدلل ہے۔ متانت کا دامن کسی حال میں ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ نکاتِ احسن مارہروی پر

جو مضمون ہے وہ خاص طور پر مفید اور اردو ادب کے ہر طالب علم کے لیے لائقِ مطالعہ ہے بعض مضمون اصلاً انگریزی میں لکھے ہوئے تھے یہاں ان کا محض ترجمہ ہے۔ پوری کتاب مصنف کی وسعتِ مطالعہ حسنِ ذوق اور شرافتِ تحریر کی گواہ ہے۔" قیمت مجلد ؎ غیر مجلد للعہ

(۶) **فارسی کے قدیم شعراء:**۔ اس مجموعے میں اندقی، برہانی، معزی، عثمان مختاری، شنائی، عمادی، عبدالواسع جبلی، سوزنی، انوری، ابو العلاء گنجوی، ادیب صابر، نجیب الدین جرباد قانی وغیرہ قدیم فارسی شعراء پر تحقیقی مقالات ہیں اور ان شعراء کے متعلق ایسی معلومات ہیں جو کسی کتاب میں موجود نہیں۔ یہ مقالات انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں شامل ہو چکے ہیں (زیر طبع)

(۷) **رسائل مشاہیر نقشبندیہ:** حضرت خواجہ خواجگان بہاء الدین نقشبند بخاری قدس سرہٗ، حضرت خواجہ عزیزانِ علی رامیتنی، حضرت خواجہ عبید اللہ احرار، حضرت مولانا یعقوب چرخی، خواجہ عبید اللہ (خواجۂ کلاں) خواجہ عبد اللہ (خواجہ خورد) اور حضرت شاہ غلام علی دہلوی رحمۃ اللہ علیہم کے بیش بہا فارسی رسالوں کا مجموعہ ہے۔ اس کا ہر فقرہ بے شمار نکات و کیفیات کا خزانہ ہے تصوف کے موافق اور مخالف سبھی کے لیے قابل مطالعہ ہے۔ قیمت عہ

(۸) **ملفوظات:**۔ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند بخاری قدس سرہٗ، خواجہ محمد پارسا، مولانا شمس الدین رومی، مولانا عبد الرحمٰن جامی، مولانا سعد الدین کاشغری، مولانا علاء الدین اور مولانا عبید اللہ رحمہم اللہ کے نادر اور نایاب ملفوظات کا یہ مجموعہ ہے۔ اسی کے آخر میں رسالہ مراتب ستہ، تحفۂ مرسلہ اور توضیحِ مصطلحاتِ صوفیہ جیسے اہم متصوفانہ رسالے بھی شامل ہیں۔ قیمت عہ

(۹) **ارشادِ رحیمیہ:**۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد حضرت شاہ عبد الرحیم رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فارسی رسالہ نقشبندیہ سلوک سے متعلق اذکار، مصطلحات اور توجہ وغیرہ پر مشتمل ہے اور بہت نافع و جامع ہے۔ اردو ترجمہ بھی ساتھ ہے۔ قیمت عہ

(۱۰) **ہدایت الطالبین:** حضرت شاہ ابو سعید زکی القدر دہلوی علیہ الرحمۃ (م ۱۲۵۰ھ) کا یہ گرانقدر فارسی رسالہ نقشبندیہ سلوک سے متعلق ہے۔ اس میں تمام اسباق کی تفصیل نہایت

آسان الفاظ میں ہے۔ اردو ترجمہ بھی ساتھ ہے۔ قیمت ۸؍

(۱۱) **تحفۂ زواریہ**:- حضرت شاہ احمد سعید دہلوی علیہ الرحمۃ (دم ۱۲۷۷ھ) کے نایاب فارسی مکتوبات کا مجموعہ ہے۔ مسائل شریعت و طریقت کا نچوڑ ہے اور ادب و تاریخ کے لحاظ سے بھی اہم ہے۔ پہلی بار شائع ہوا ہے۔ قیمت ۸؍

(۱۲) **سندھی اردو لغت**: یہ لغت ڈاکٹر بلوچ صاحب کی معیت میں تیار کی ہے اور پوری تصحیح ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب نے خود ہی کی ہے۔ بڑی تقطیع کے ۸۶۶ صفحات ہیں۔ قیمت ساڑھے بارہ روپے۔ (۱۲؍۸)

(۱۳) **اردو سندھی لغت**: یہ لغت بھی ڈاکٹر بلوچ صاحب کی معیت میں تیار کی ہے اور پوری تصحیح ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب نے کی ہے۔

(۱۴) **تفسیر مولانا عبید اللہ سندھیؒ**:- فی الحال آخری پارے کو زبان کی پوری تصحیح کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ قیمت ۵؍

(۱۵) **ادبی جائزے**:- یہ سترہ تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ مختلف شعراء اور مصنفین کے کارناموں پر بہت سلجھے ہوئے تبصرے ہیں جو تلامذہ اور اساتذہ سب ہی کے لیے مفید ہیں۔ قیمت ۳؍۸

ان کے علاوہ دیوانِ عظیم تتوی اور دیوانِ روشن
وغیرہ زیر طبع ہیں۔

٭

ناشر

عبدالرحمٰن خاں ۳۲۸/ب پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی

(ایجوکیشنل پریس کراچی)